یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

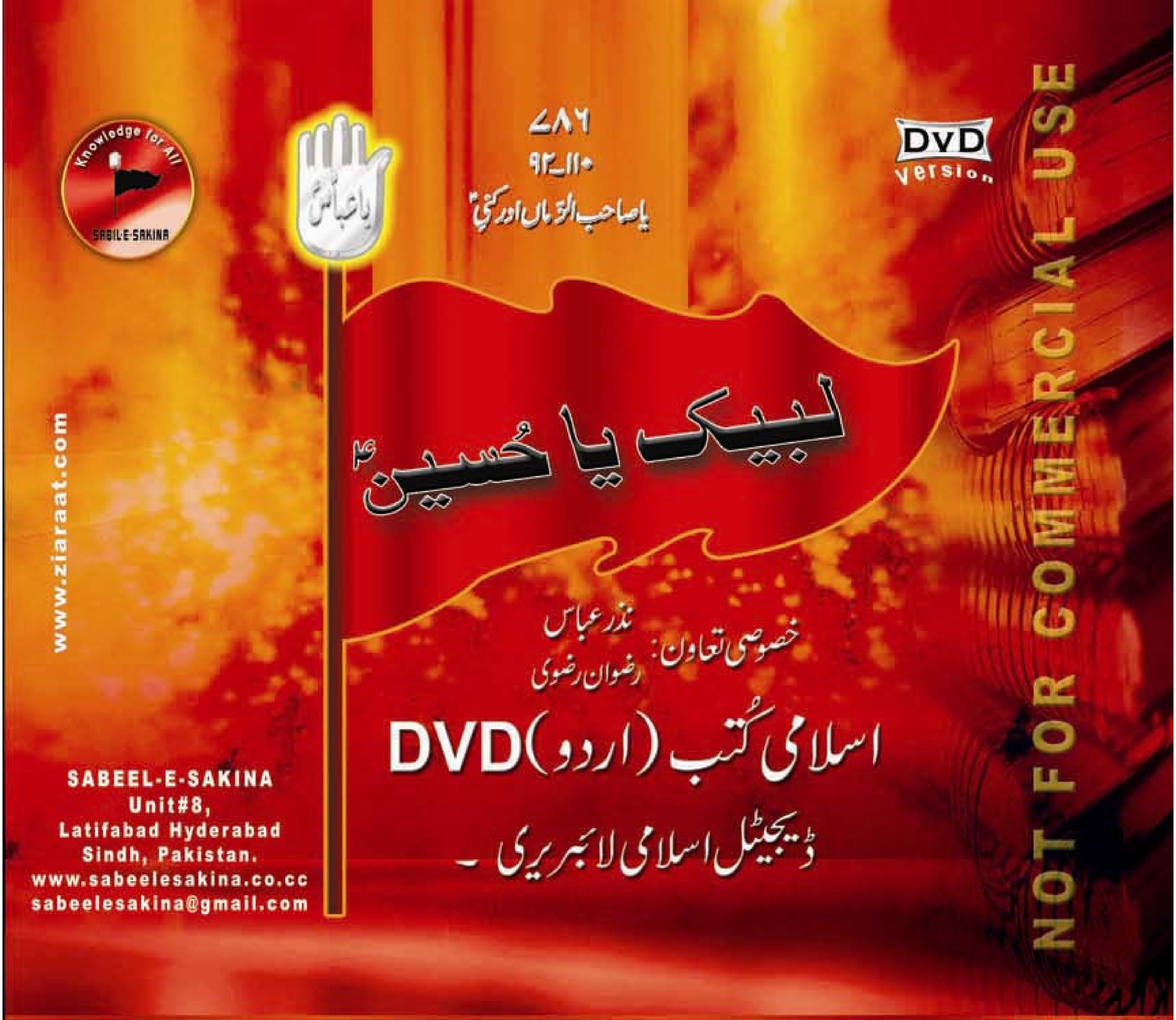

Knowledge for All
SABIL-E-SAKINA
یا عباس
۷۸۶
۱۱۰_۹۲
یا صاحب الزماں ادرکنی
DvD
Version
NOT FOR COMMERCIAL USE
لبیک یا حسینؑ
www.ziaraat.com
خصوصی تعاون:
نذر عباس
رضوان رضوی
اسلامی کُتب (اردو) DVD
ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔
SABEEL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.co.cc
sabeelesakina@gmail.com

علی اکبر شاہ

مقتلِ عمرؓ

مقتلِ عمرؓ
مقتلِ عمرؓ
مقتلِ عمرؓ

؟

حمایتِ حق پبلیکیشنز

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

بار اوّل	۱۹۸۵ء
تعداد	ایک ہزار
بار دوئم (مع ترمیم و اضافہ)	۱۹۹۱ء
تعداد	ایک ہزار

قیمت :-

عُنوانات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	ابتدائیہ	۵
۲	ابتدائی حالات	۱۳
	شجرۂ نسب	۱۳
	والد	״
	والدہ	״
	پیدائش	۱۴
	نام اور کنیت	״
	لقب	״
	حلیہ	۱۶
	خاندانی عزوشرف	۱۷
	پیشہ	۲۲
۳	قبول اسلام	۲۸
۴	عمرؓ مدینہ میں	۳۹
	دینی اور انتظامی خدمات	۴۰
	دعاۃ	״
	قضاۃ	״
	کتابت	״
	حاکم ووالی	״
	پولیس	״
	جلاد	״
	جنگی خدمات	۴۱
	غزوۂ بدر	״
	غزوۂ احد	۴۹
	غزوۂ خندق	۵۶
	غزوۂ حدیبیہ	۶۲
	غزوۂ خیبر	۶۶
	فتح مکہ	۶۹
	غزوۂ حنین	۷۰
۵	حفصہ بنت عمرؓ کا رسول اللہؐ سے نکاح	۷۴
۶	رسول اللہؐ کی آخری خدمت	۷۵
۷	بعد وفاتِ رسولؐ	۸۲
۸	عمرؓ دورِ ابوبکرؓ میں	۹۰
۹	ابوبکرؓ کی وفات اور عمرؓ کی نامزدگی	۹۴
۱۰	عمرؓ بحیثیت خلیفہ	۹۶
	عراق پر لشکر کشی	״
	بے پناہ دولت کا حصول	۱۰۲
	لشکر کشی کے اسباب	۱۰۵
	فتوحاتِ شام	۱۰۹
	لشکر کشی کی وجوہات	۱۱۳
	مصر کی فتح	۱۱۴
	مصر پر لشکر کشی کیوں کی گئی	۱۱۷
۱۱	وفاتِ حضرت عمرؓ	۱۲۰
	جانشینی کیلئے شوریٰ کا قیام	۱۲۷
۱۲	حضرت عمرؓ کی حکمرانی	۱۳۰

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	بحیثیت نائب رسولؐ	
	فتوحات	۱۳۰
	کتاب وحکمت کی تعلیم	۱۳۷
	لختِ جگر پر کوڑوں کی بارش	۱۴۰
	خوبصورتی کی بھیانک سزا	۱۴۶
	عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کا عشق	۱۴۷
	ذمیوں کے ساتھ سلوک	۱۴۸
	بحیثیت دنیاوی حکمران	۱۵۰
	فتوحات	۱۵۱
	داخلی امن	۱۵۳
	خوشحالی	۱۵۶
	عدل وانصاف	۱۵۸
۱۳	**عمرؓ اور جمہوریت**	۱۶۲
۱۴	**حضرت عمرؓ کے فضائل**	۱۶۶
	شیطان کا دور بھاگنا	״
	اذان کی تجویز	۱۶۸
	منافق کی نمازِ جنازہ اور عمرؓ	۱۷۱
	اسیرانِ بدر کے بابت [illegible]	۱۷۴
۱۵	**حضرت عمرؓ کی عادات و خصائل**	۱۷۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	قرض داری۔ بسیارخوری آلِ خطاب کا روپیہ مال	۱۷۸
	بدمزاجی	۱۸۲
	وحشت دیر ریب	۱۸۳
	گریہ وزاری	۱۸۴
	دخل در معقولات	۱۸۵
	کھڑے کھڑے پیشاب کرنا	۱۸۹
	اعتراضات اور پچھتاوے	۱۹۰
	اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہوجاتا	״
	عمرؓ تجھ کو تیری ماں گم کرے	״
	یارسول اللہؐ آپ مجھے جان سے زیادہ عزیز نہیں	״
	میں نے رات کو اپنی سواری بیچ دی	۱۹۱
	کاش میں گھاس کا پتہ ہوتا	״
	کاش میں دنبہ ہوتا	״
	باغیانہ روش	״
	حجرِ اسود کی توہین	״
	خانۂ کعبہ کے سامان کو لوگوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ	۱۹۲

★

ابتدائیہ

ہم نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر لکھنے کا ارادہ کیا اور جب یہ فیصلہ کیا کہ تاریخ کے تقاضے بھی پورے کریں گے تو لرز گئے کہ مسلمانوں کی حکومت اور پھر ایسی جلیل القدر ہستی کہ جسے نوع انسانی میں بعد انبیاء (ابو بکرؓ کو چھوڑ کر) سب سے افضل سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ سچ بولتی ہے اور مسلمان یہ سچ پسند نہیں کریں گے۔ وہ تو قومی درسگاہوں میں کچھ اور پڑھتے ہیں۔ انہیں تو اعلیٰ ترین درسگاہوں میں بھی آزاد ذہن سے تحقیق کی اجازت نہیں اور پھر وہ لوگ کہ جن کی تاریخی اور مذہبی معلومات میلاد کی محفلوں تک ہے۔ انہیں یہ سمجھایا جائے گا کہ یہ بکواس کسی رافضی کی ہے اور وہ قابل گردن زدنی ہے۔ مگر ہمیں یہ سوچ کر ڈھارس ہوئی کہ اسی مسلم مملکت میں تو ناصبیوں کو بھی لکھنے کی کھلی آزادی ہے کہ وہ علی ابن ابی طالب اور اولاد فاطمہ زہرؑ کے بارے میں جو جی چاہے لکھیں اور پھر اس طرح سے لکھیں

کہ کھلم کھلا توہین آمیز الفاظ اور پھبتیاں وہ بھی بغیر کسی معقول بنیاد کے۔ اکثر باتیں بغیر کسی حوالہ اور معقول دلیل کے۔ نمونہ کے طور پر صرف شمائل علی ملاحظہ فرما لیجئے کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتابوں کی علمی حلقوں میں کوئی وقعت نہیں ہوتی اور مصنف کا مقصد بھی دل کی بھڑاس نکالنا اور سستی شہرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایک طرف تو ان ناصبیوں کا یہ انداز کہ علیؑ اور اولاد فاطمہ کی منزلت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری طرف بنی امیہ کے سیاہ کاروں کی سیاہی کو ان کے منحوس چہروں سے صاف کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

رسولؐ کے چچا حمزہ کا کلیجہ چبانے والی کے پوتے اور آزاد کردہ رسول کے بیٹے "یزید" کہ نام گالی بن چکا ہے۔ مگر رحمت اللہ علیہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ جس سلسلہ کو محمود احمد عباسی نے شروع کیا تھا وہ برابر جاری ہے اور اس کار بد میں ایک عورت زدہ ڈاکٹر بھی بڑے پراسرار انداز سے شریک ہے۔

ہم نے سوچا کہ اس آزادی فکر و قلم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک اہم فریضہ پورا کر دیا جائے تو بڑا اچھا ہو۔ ہمارے ملک میں ہر طرف اسلامی نظام کے نفاذ کا چرچا ہے اور اس نظام کی نمائندہ شخصیت حضرت عمر بن خطاب کو قرار دیا جاتا ہے اور مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ملک میں انہی کے طریقہ پر حکومت چلائی جائے تو ایسے میں اگر تاریخ کی روشنی میں حضرت عمر کے صحیح مقام کا تعین کر لیا جائے تو اچھا ہے اس طرح سے ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ کیا واقعی حضرت عمر کو اسلام کی نمائندہ شخصیت کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے یا نہیں، اور پھر یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ کیا فاروق اعظم کا انداز اس مہذب دور میں چل بھی سکتا ہے یا نہیں۔

دنیا کا یہ اصول رہا ہے کہ وہی قومیں ترقی کرتی ہیں کہ جو جذبات سے ہٹ کر معروضی نقطہ نگاہ سے اپنی تاریخ کا جائزہ لیتی ہیں اور پھر اپنے لئے کوئی لائحہ عمل وضع کرتی ہیں مگر ہم مجبور ہیں۔ مذہب کا مسئلہ پیدا کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ ہی کو لے لیجئے۔ ان پر آزادی سے کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ اگر کچھ لکھا ہے تو شیعوں نے مگر ضمناً۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک کے پڑھے لکھے محب وطن افراد تاریخی حقیقتوں کو جانیں اور مولویوں کے شر سے محفوظ رہیں۔ ہماری گذارش ہے کہ اس کتاب کو کسی فرقہ کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔ یہ تو ایک محب وطن شہری کی ایک کوشش ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں حضرت عمرؓ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو سامنے لے آئیں اور آپ کی دینی حیثیت کو واضح کر دیں۔ دوران تحریر اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ کوئی لفظ خلافِ شان نہ نکل جائے۔ پھر بھی اگر کہیں ایسا محسوس ہو تو اسے عبارت کی مجبوری سمجھا جائے۔ اس کتاب کے پڑھنے والوں سے ہماری یہ گذارش ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیکر تصور کریں کہ کیا اس دور میں ان کے نقش قدم پر چلا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر کے کوڑے ہی کو لے لیجئے کہ ہر وقت آپ کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ آپ پڑھیں گے کہ اس کی مار سے بعض جلیل القدر صحابہ بھی نہ بچ سکے تو اگر آج کی حکومت کا سربراہ ہاتھ میں کوڑا رکھے اور وقت ضرورت اپنے وزراء اور ممبران اسمبلی کی پیٹھ پر رسید کرے تو کیسا لگے گا۔

ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ مولوی صاحبان اکثر یہ کہا کرتے ہیں کہ اللہ تمام صحابہ سے راضی ہو چکا ہے اور سارے صحابہ عادل ہیں۔ یہ سب کے

سب ستاروں کی مانند ہیں جس کی بھی پیروی کروگے نجات پاؤگے۔ تو بھلا ان کے نزدیک کسی صحابی کی شخصیت کا تنقیدی انداز سے جائزہ لینا کیسے صحیح ہو سکتا۔ چاہے وہ کسی صحت مند مقصد کے حصول ہی کیلئے کیوں نہ ہو۔

مسلمان سمجھتے ہیں کہ ہزاروں آدمی جو اسلام لائے اور مرتے دم تک اسلام پر قائم رہے اور رسولؐ اللہ کی صحبت اٹھائی، چاہے وہ مختصر ترین ہی رہی ہو، صحابی ہوتے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہزاروں افراد محض اس صحابیت کی وجہ سے عادل اور قابل تقلید ہو جائیں۔ یہ صرف نظری مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض صحابہ۔ شراب نوشی کے مرتکب ہوئے کون نہیں جانتا کہ ابو محجن کو شراب نوشی کے جرم میں پابہ زنجیر کر دیا گیا تھا اور آپ قادسیہ کی جنگ کے موقع پر قید تھے۔ ابو محجن نے شراب پی کر اپنے نفس پر ظلم کیا تو صفت عدل کہاں باقی رہ سکتی ہے۔ سیرت النبی میں شبلی نعمانی نے بعض افراد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اکثر (تہذیب و تمیز کے فقدان کے سبب) مسجد کے فرش اور دیواروں پر تھوک دیا کرتے تھے اور پھر رسولؐ ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اس تھوک کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات بھی صحابی ہی تھے اور وہ لوگ بھی صحابی تھے کہ جو نماز جمعہ کے دوران تجارتی قافلہ کی خبر سن کر مال دنیا کے لئے مسجد سے چلے گئے تھے۔ اور وہ لوگ بھی صحابی ہی تھے کہ جو میدان جہاد سے بھاگ جایا کرتے تھے۔ یقیناً یہ حضرت نہ تو قابل تقلید ہو سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں عادل کہا جا سکتا ہے اور پھر ہزاروں ایسے بھی تھے کہ جو اس وقت اسلام لائے کہ جب بچت کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یعنی فتح مکہ کے موقع پر ظاہر ہے کہ ان سب کے تو اسلام پر بھی یقین نہیں کیا جا سکتا۔

یہ اصول کہ جس کلمہ گو نے رسولؐ اللہ کی محض تھوڑی سی بھی صحبت

اٹھائی وہ عظمت کی بلندی پر پہنچ کر قابلِ تقلید بن گیا نہ صرف مضحکہ خیز ہے بلکہ خلاف عدل بھی ہے۔ یہ اسی اصول کی برکت ہے کہ عمر ابن عبدالعزیز جیسے زاہد و متقی خلیفہ کے لئے کسی کے استفسار پر ایک فقیہ نے کہا کہ معاویہ کے گھوڑے کے سموں سے اٹھنے والی گرد عمر ابن عبدالعزیز سے بہتر ہے۔ کیونکہ معاویہ صحابی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اگر صحابہ کرام سے بدگمانی رکھی گئی تو اسلام کا خدا حافظ ہے۔ کیونکہ ہم تک سب کچھ صحابہ ہی کے ذریعہ پہنچا ہے۔ ہمیں بھی اس کا اعتراف ہے مگر بہت سے ایسے صحابہ ہیں کہ جن سے کوئی بدگمانی نہیں۔ سلمان فارسیؓ۔ ابوذر غفاریؓ۔ مقداد بن عمروؓ۔ عمار یاسرؓ۔ بلالؓ ابی بن کعبؓ۔ عبداللہ بن مسعودؓ۔ معاذ بن جبلؓ۔ حذیفہ یمانیؓ۔ ابوایوب انصاریؓ۔ جابر بن عبداللہ انصاریؓ۔ عبداللہ ابن عباسؓ ان کے علاوہ سب سے بڑی شخصیت علی ابن طالبؑ کی ہے کہ جو گھر میں اور گھر کے باہر ہر جگہ رسول اللہؐ صلعم کے ساتھ رہے۔ آغوش رسول میں پرورش پائی اور آخری وقت تک ساتھ رہے۔ جہاں تک حضرت عمر کا سوال ہے تو اگر ان سے بدگمانی رکھی بھی جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ آپ کے ذریعہ سے اصل دین تو بہت کم پہنچا آپ نے خود کل ستّر حدیثیں روایت کیں اور دوسروں کو اشاعت حدیث سے منع فرمایا۔

مولانا شبلی نعمانی تذکرۃ الحفاظ ذہبی کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

"حضرت عمر اس ڈر سے کہ صحابہ آنحضرت سے روایت کرنے میں غلطی نہ کریں۔ صحابہ کو حکم دیتے تھے کہ رسول اللہؐ صلعم سے کم روایت کریں تاکہ لوگ حدیث میں مشغول ہو کر قرآن کی یاد سے غافل نہ ہو جائیں۔

(الفاروق)

بعض روایات کے مطابق حضرت عمرؓ نے صرف ان احادیث کو بیان کرنے کی اجازت دی ہوئی تھی کہ جن کا تعلق عبادات سے تھا۔ مگر احادیث کو ضبط تحریر میں لانے سے آپ طرح طرح کے خدشات میں مبتلا ہوجاتے تھے۔ لہذا آپ نے صحابہ کی جمع کردہ احادیث کو نذر آتش کر دیا۔ ایک روایت کے مطابق عمرؓ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

اے لوگو! میں نے سنا ہے کہ تمہارے پاس کتابیں ہیں۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کتاب وہ ہے جس کی بنیاد سب سے زیادہ عدالت اور راستی پر ہو۔ جس کسی کے پاس کتاب ہو وہ میرے پاس لے آئے تاکہ میں ان کتابوں کے بارے میں غور و فکر کروں۔"

لوگوں نے خیال کیا کہ وہ انہیں پڑھنا چاہتے ہیں اور انکے اختلاف دور کرنے کے لئے ان میں اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سبھی لوگ کتابیں لے آئے اور انہوں نے ان سب کو جلا دیا۔

(خطیب بغدادی صد ۵۲، مطبوعہ مصر ـ طبقات الکبریٰ جلد ۵ صد ۱۸۸، مطبوعہ بیروت)

حضرت عمرؓ نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے ابوذر، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن حذیفہ، ابودرداء اور عقبہ بن عامر وغیرہ کو مدینہ طلب فرمایا اور سب کو جمع کر کے کہا۔

"یہ حدیثیں کیا ہیں جو تم نے دنیا میں پھیلا رکھی ہیں؟" انہوں نے کہا۔ "کیا تو ہمیں حدیث نقل کرنے سے منع کرتا ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "نہیں۔ میں تمہیں منع نہیں کرتا تم لوگ یہیں مدینہ میں میرے پاس رہو اور میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں تم میری نظروں سے اوجھل نہیں رہو گے اور اس شہر سے

باہر نہیں جاؤ گے۔ ہم زیادہ دانا ہیں اور بہتر جانتے ہیں کہ جو احادیث تم نقل کرتے ہو ان میں سے کون سی قبول کریں اور کون سی رد کریں لیکن دوسرے لوگ نہیں جانتے کہ کیا قبول کریں اور کیا نہ کریں۔"

(کنز العمال جلد ۵ صہ ۲۳۹، حدیث ۴۸۶۵ پہلا ایڈیشن)

احادیث کی اشاعت سے لوگوں کو روکنے کی وہ وجوہات نہیں تھیں کہ جو روایات میں بیان کی گئی ہیں۔ بلکہ اصل وجوہات یہ تھیں کہ عمرؓ یہ نہیں چاہتے تھے کہ احادیث کی عام اشاعت سے ان کے مفادات خطرے میں پڑیں۔ اس اوپر والی روایت ہی کو لے لیجئے۔ کہ اس میں صحابہ کرام کی صداقات پر شک نہیں کیا گیا ہے (کیونکہ ان میں ابوذر جیسے صحابی بھی موجود تھے) بلکہ یہ کہا گیا کہ ہم زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ کون سی حدیث قبول کریں۔ اور کون سی رد کریں۔ اگر ذرا گہری نظر سے اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اشاعت حدیث کے متعلق یہ پالیسی ایک منظم سازش کا نتیجہ تھی۔ جس کی ابتدا اس وقت ہوئی جب رسول اللہ صلعم نے اپنی وفات کے قریب کاغذ و قلم مانگا تاکہ امت کے لئے ایک وصیت نامہ چھوڑ جائیں اور وہ کبھی گمراہ نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے کاغذ و قلم نہیں دینے دیا اور رسولؐ وصیت نہ فرما سکے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دور حکومت میں لوگوں کو اشاعت حدیث سے روکا اور خود اپنا مجموعہ حدیث نذر آتش کر دیا تاکہ وہ دوسروں کے لئے جمع حدیث کا جواز نہ بن جائے۔ جب حضرت عمر برسر اقتدار آئے تو انہوں نے بھی حضرت ابوبکر کی پالیسی کو (جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں) جاری رکھا ان کے بعد حضرت عثمان تشریف لائے تو انہوں نے کھل کر اعلان کر دیا

" جو احادیث ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ میں بیان نہیں کی گئیں وہ اب

بھی بیان نہ کی جائیں اور جو احادیث عمرؓ کے زمانہ اور ان کی اجازت سے نقل کی گئی تھیں وہ اب بھی نقل کی جا سکتی ہیں۔"

(برحاشیہ مسند احمد جلد ۴ صہ ۶۴)

پابندی کا یہ سلسلہ ۱۰۰ ہجری تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ بنوامیہ کے ایک شریف حکمراں عمر بن عبدالعزیز نے اس پابندی کو ختم کیا۔

اس پابندی کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ عام مسلمان کہ جو مرکز اسلامی سے دور تھے یا جنہوں نے رسول کا دور نہیں دیکھا تھا وہ اسی اسلام کو پہچانیں کہ جسے یہ لوگ پہچوانا چاہتے تھے۔ مگر صحیح اسلام پہچاننے والی قوتیں بھی ڈٹی ہوئی تھیں۔ ابوذر غفاری کسی قیمت پر بھی اپنی زبان بند کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اور یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ حاکم وقت حضرت عثمان کے حکم سے جلا وطن کر دیئے گئے اور ایک ویران جگہ "ربذہ" بھیجے گئے کہ جہاں کوئی حدیث سننے والا ہی نہ ہو۔ اسی جرم میں ایک اور صحابی میثم تمار کو اموی گورنر ابن زیاد نے سولی پر چڑھا دیا۔ آپ بھی ان احادیث کو بیان کرنے سے باز نہیں آئے تھے کہ جو حضرت علی نے آپ کو لکھوائی تھیں۔

آپ نے اچھی طرح ملاحظہ کر لیا کہ حضرت عمر اور ان کے رفقاء کا اشاعت اسلام میں کیا حصہ ہے۔ تو حاصل کلام یہ ہے کہ مسلمانوں مولوی صاحبان کے اس پروپیگنڈے سے متاثر نہیں ہونا چاہیے کہ اگر چند صحابہ کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو اسلام خطرے میں پڑ جائے گا۔

آخر میں ہم اپنے قاری سے گذارش کریں گے کہ اس کتاب کو تاریخی نکتہ نظر سے پڑھا جائے اور اس پر کسی مخصوص فرقہ کا لیبل نہ لگایا جائے۔

والسلام   علی اکبر شیخ کہ

ابتدائی حالات

شجرِ نسب:

عمر بن خطاب بن نفیل بن عبد العزیٰ بن ریاح بن عبد اللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب ۔

والد: خطاب ابن نفیل بڑے بد مزاج اور تشدد پسند آدمی تھے اور مغلظات خوب بکتے تھے۔ اپنے لختِ جگر کے ساتھ بھی بڑے بے رحم تھے۔ اپنی خلافت کے زمانہ میں ایک دفعہ حضرت عمرؓ ضجنان کی وادی سے گذر رہے تھے کہ بچپن یاد آ گیا۔ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ میں بالوں کی بنڈی پہنے ہوئے خطاب کے اونٹ چراتا تھا۔ وہ بہت سخت آدمی تھے۔ میں کوئی کام کرتا تو میرا دیکھا کرتے اور اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہوتی تو مارتے اور آج یہ دن ہے کہ خدا کے سوا میرے اوپر کوئی حاکم نہیں۔

والدہ:

والدہ کا نام حنتمہ تھا۔ ایک روایت کے مطابق آپ ہشام بن مغیرہ کی بیٹی تھیں اور دوسری کے مطابق آپ ہاشم بن مغیرہ کی بیٹی تھیں اگر پہلی روایت کو صحیح سمجھا جائے۔ تو آپ ابو جہل کی حقیقی بہن ہوئیں

ورنہ چچا زاد بہن۔

پیدائش :

طبری نے اسلح کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت عمر کو یہ کہتے سنا کہ میں فجار کی سب سے بڑی اور آخری جنگ سے چار سال قبل پیدا ہوا۔ علامہ ابن اثیر کے مطابق حضرت عمر واقعہ فیل کے ۱۳ برس بعد پیدا ہوئے۔ علامہ شبلی نعمانی الفاروق میں لکھتے ہیں کہ "مشہور روایت کے مطابق حضرت عمر ہجرت نبوی سے ۴۰ برس قبل پیدا ہوئے۔"

نام اور کنیت :

آپ نے عمر کے نام سے شہرت پائی۔ کنیت آپ کی ابو حفص تھی۔ مگر ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں آپ کو عمیر کہا جاتا تھا پھر عمر کہا جانے لگا۔ عقد فرید جلد اول میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ معلیٰ بن جارود عبدی کے ساتھ گھر سے باہر نکلے تو راستے میں ایک عورت ملی اس نے آپ کو آواز دے کر کہا، اے عمر ہم لوگ مدت تک تمہیں عمیر جانتے رہے پھر تم عمر ہو گئے۔ اب امیر المومنین بن گئے۔ تو اے خطاب کے لڑکے اللہ سے ڈرو اور لوگوں کے امور میں غور و فکر کیا کرو۔ یہ بنو ہاشم کی خولہ بنت حکیم تھیں۔

لقب :

آپ کا لقب فاروق مشہور ہوا اور پھر فاروق اعظم۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ کو یہ لقب کس نے عطا کیا۔ طبری آپ کے اس لقب کے بارے میں کہتا ہے کہ "آپ فاروق کے لقب سے بھی مشہور تھے۔ بزرگان سلف کا اس میں اختلاف ہے کہ کس نے آپ کو یہ لقب دیا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا یہ نام رکھا۔ (اردو ترجمہ تاریخ طبری، نفیس اکیڈمی کراچی صہ ۲۴۶)

ابن اثیر نے تاریخ کامل میں لکھا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا لقب فاروق رکھا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اہل کتاب نے آپ کا نام فاروق رکھا۔" (ترجمہ الکامل ابن اثیر ناشر دائرہ معین المعارف صہ ۳۷۵)

کئی مستند کتابوں میں ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں۔ جن کے مطابق رسول اللہ نے حضرت علی ابن ابی طالب کو فاروق کہا۔ کنزالعمال میں ہے۔

سیکون بعدی فتنۃ فاذا کان ذلک فالزموا علی ابن ابی طالب فانہ الفاروق بین الحق والباطل۔ میرے بعد فتنہ ہوگا۔ جب وہ وقت آئے تو تم سب علی کی پیروی کرنا وہی حق و باطل کے درمیان فاروق (فرق کرنے والے) ہیں (کنزالعمال جلد ۶ صہ ۱۵۵ دائرۃ المعارف نظامیہ حیدرآباد دکن)

ریاض نضرہ میں ہے کہ عن ابی ذر قال سمعت رسول اللہ یقول لعلی انت الصدیق الاکبر وانت الفاروق الذی تفرق بین الحق والباطل۔ ابوذر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو حضرت علی سے فرماتے سنا کہ تم ہی صدیق اکبر ہو اور تم ہی فاروق ہو جو کہ حق و باطل کے درمیان فرق کرو گے۔

(ریاض نضرہ جلد ۲ صہ ۱۵۵ مطبوعہ مصر ۱۳۲۷ھ)

شاہ عبدالعزیز دہلوی فتاوے عزیزی میں لکھتے ہیں کہ دو احادیث صحیحہ کنیت شان بابوتراب وابوالریحانتین وتلقیب الشان بہ ذوالقرنین ولعیسوب الدین وصدیق وفاروق .... صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ ان کی کنیت ابوتراب و ابوالریحانتین اور ان کے لقب ذوالقرنین و لعیسوب الدین و صدیق اور فاروق ہیں۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ فاروق کا لقب اگر حضرت عمرؓ کو رسول اللہ نے ہی دیا تھا تو اس کا موقع محل کیا تھا۔ یہ واضح نہیں ہوسکا۔ جبکہ حضرت علی کی بات واضح ہے کہ بعد وفات رسول فتنہ کی ابتداء

ہوئی۔

پھر جمل اور صفین میں تو یہ بات اور واضح ہو گئی. علی کے مخالفین تلوار لے کر مقابلے پر آگئے اور ہزاروں کلمہ گو قتل ہوئے تو ایک ہی فریق حق پر ہو سکتا ہے. لہذا رسول اللہ نے علی کو مخاطب کر کے یہ فرمایا کہ تم ہی حق و باطل کے درمیان فاروق ہو۔ اب اس سلسلہ میں کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی زندگی حق و باطل کا فرق واضح کرتی ہے. مگر ایسا نہیں ہے. آپ کے ہر عمل کو حق قرار نہیں دیا جا سکتا.

ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر کو فاروق کا لقب اہل کتاب نے دیا ہو اور اگر ایسا ہے تو مسلمان کے نزدیک اس کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے. آج کل بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی فرد کسی اہم موقع پر کسی شخص کو کسی لقب سے پکارتا ہے. اور وہ لقب شہرت پا جاتا ہے اور بعض اوقات وہ شخصیت اس لقب کی مصداق بھی نہیں ہوتی ہو سکتا ہے کہ یہی صورت حضرت عمر کے ساتھ رہی ہو. کہ اہل کتاب نے کسی وجہ سے آپ کو فاروق کہا ہو اور اس بات کو شہرت ملنا شروع ہو گئی ہو تو جناب رسولِ خدا کو علی سے یہ کہنا پڑا کہ تم ہی فاروق ہو اور ساتھ ہی ساتھ وجہ بھی بتا دی کہ میرے بعد جب فتنہ پھیلے گا تو تم ہی حق و باطل کے درمیان فرق کرو گے۔

حلیہ :

آپ کے حلیۂ مبارک کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ درازیٔ قد اور گنجے پن کے بارے میں تو سب راوی متفق ہیں مگر بعض کا خیال ہے کہ آپ کے بال بڑھاپے میں گر گئے تھے. رنگ کے بارے میں راویوں میں اختلاف ہے. زیادہ تر تو سرخ و سفید رنگ کے قائل

ہیں مگر بعض کے مطابق آپ کا رنگ گندمی تھا اور بعض کے مطابق کالا۔ ہمارے خیال میں تینوں ہی باتیں صحیح ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شروع جوانی میں آپ کا رنگ سرخ و سفید ہو اور بعد میں گندمی ہو گیا ہو۔ پھر آخری عمر میں کالا پڑ گیا ہو۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے قحط کے زمانہ میں گھی اور دودھ کا استعمال ختم کر دیا تھا اور روغن زیتون پر گذر کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے رنگ کالا پڑ گیا تھا۔

اسد الغابہ جلد ۷ میں ہے کہ آپ کی داڑھی بڑی تھی اور چولہا پھونکتے وقت دھواں آپ کی داڑھی کے درمیان سے نکلتا تھا اور اصابہ جلد ۴ کے مطابق مونچھیں بڑی تھیں۔ جن کے سرے بھورے تھے۔ دونوں کلے پچکے ہوئے تھے۔ بائیں ہاتھ سے کام کرتے تھے (بعض روایتوں کے مطابق دونوں ہاتھوں سے یکساں کام کرتے تھے) اور "اروح" تھے۔ یعنی چلنے میں دونوں ایڑیاں ایک دوسرے کے قریب رہتی تھیں۔ استیعاب ابن عبد البر جلد ثانی کے مطابق پیر میں لنگ تھا۔

انسان العیون فی سیرت المامون کے مطابق حضرت عمر اور خالد بن ولید کے درمیان بچپن میں کشتی ہوئی تھی۔ کیونکہ خالد قوی تھے۔ انہوں نے عمرؓ کی پنڈلی توڑ دی۔ بعض کا خیال ہے کہ شاید یہ نقص اسی وجہ سے رہ گیا ہو۔ کتاب الدول اسلام ذہبی میں ہے کہ حضرت عمر بھینگے تھے۔

خاندانی عزت و شرف :

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی دادی صہاکہ زبیر بن عبد المطلب کی حبشی کنیز تھیں اور نفیل بن عبد العزیٰ جو کہ حضرت عمرؓ کے دادا تھے انہوں نے اس پر تصرف حاصل کیا تو تو حضرت عمرؓ کے والد خطاب پیدا ہوئے۔ اسی کنیز یعنی خطاب کی والدہ

کے بارے میں علامہ ابن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے کہ "امراۃ من فھم کانت تحت نفیل (بن عبدالعزے جد عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ) فتزوجھا عمرو بن نفیل بعد ابیہ فولدت لہ زیداً فامہ ام الخطاب وزید (ھذا) ھو ابو سعید بن زید بن عمرو بن نفیل." یعنی خاندان فہم کی ایک عورت نفیل (بن عبدالعزے جد عمر بن الخطاب) کے تصرف میں تھی. جب نفیل کا انتقال ہوگیا تو ان کے بیٹے عمرو بن نفیل نے اپنے باپ کے بعد ان کی اس عورت کو اپنے تصرف میں لے لیا تو اس عورت سے عمرو بن نفیل کے بیٹے زید پیدا ہوئے۔ اس طرح زید کی ماں ہی خطاب کی ماں تھیں اور یہ زید سعید بن زید بن عمرو بن نفیل کے باپ تھے۔

(المعارف ابن قتیبہ دینوری مطبوعہ ۱۳۵۳ھ ص ۷۸)

اسی طرح سے یہاں محرمات پر تصرف کی اور بھی روایات موجود ہیں کہ جس کی وجہ سے حضرت عمر اور ان کے باپ دادا کے درمیان رشتے اور بھی پیچیدہ ہوجاتے ہیں۔ گو کہ ان تمام روایات کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم آپ کے نسب میں ایسی باتیں ضرور تھیں کہ جن کے زبان پر آجانے سے آپ ڈرتے تھے۔ ہم اس سلسلے میں چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

حضرت عمر کے اسلام لانے کے بارے میں علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں طویل روایت درج کی ہے کہ جس میں حضرت عمرؓ کا قتل آنحضرت کے لئے نکلنا. بہن اور بہنوئی کے اسلام لانے کی خبر سننا، انہیں زدوکوب کرنا اور پھر آیات قرآنی سے متاثر ہوکر رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہونا رسول اللہ کا عمرؓ کو تنبیہ کرنا جس پر عمرؓ کا اسلام قبول کرنا مذکور ہے حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے سلسلہ میں یہ سب باتیں تو عام طور سے

بیان کی جاتی ہیں مگر رسول اللہ کے تنبیہی فقروں کو خاص طور سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ہم ان فقروں کو پیش کرتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکان سے باہر تشریف لا کر حضرت عمرؓ کا دامن اور ان کی تلوار پکڑ لی اور فرمایا اے عمر یہ فساد تم اس وقت تک برپا کرتے رہو گے۔ جب تک تم پر بھی خواری اور ذلت اللہ کی طرف سے مسلط نہ ہو جائے جیسی ولید بن مغیرہ کے لیے ہوئی۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے کہا: "اشہد ان لا الہ الا اللہ وانک عبداللہ ورسولہ" (تاریخ الخلفاء، از علامہ سیوطی، ترجمہ شمس بریلوی صہ ۱۸۵)

واضح رہے کہ تاریخ خمیس اور روضۃ الاحباب میں بھی ولید بن مغیرہ کے حوالے سے تنبیہی فقرے درج ہیں۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ولید بن مغیرہ کے بارے میں کیا نازل ہوا۔ سورۃ القلم میں ارشاد ہوتا ہے کہ "ولا تطع کل حلاف مھین، ھماز مشاء بنمیم، مناع للخیر معتد اثیم، عتل بعد ذالک زنیم۔" یعنی اور تم (کہیں) ایسے کے کہنے میں نہ آنا جو بہت قسمیں کھاتا ذلیل اوقات، عیب جو اعلیٰ درجہ کا چغل خور، مال کا بہت بخیل حد سے زیادہ بڑھنے والا گنہگار تند مزاج اور اس کے علاوہ بد ذات، (حرامی) بھی ہے۔"

آیت کے آخر میں جو زنیم کا لفظ آیا ہے۔ اس لفظ کے معنی اور ان آیات کی شان نزول کے بارے میں تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ مجاہد، سعید ابن مسیب اور عکرمہ کہتے ہیں: زنیم وہ ہے کہ جو ولد الزنا ہو مگر اپنے کو قوم کے ساتھ نسبت دیتا ہو......... ولید دعویدار تھا قریش سے ہونے کا اور وہ قریش کی اصل میں سے نہیں تھا۔ اس کے

باپ نے اٹھارہ سال بعد اس کو اپنا بیٹا کہنے کا دعوٰی کیا ہے۔ ....
بعض مفکرین یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے لئے نازل ہوئی۔
(الجامع الاحکام القرآن (تفسیر ابن کثیر) اٹھارویں جلد مطبوعہ دارالکتب مصر ۱۳۸۶ھ صہ ۲۳۴)

تفسیر ابن کثیر کے اردو ترجمہ کے (جس کے مترجم مولوی محمد صاحب ہیں اور جو دہلی میں چھپا) انیسویں پارہ اور صہ ۱۰ پر تحریر ہے کہ لغت عرب میں زنیم اسے کہتے ہیں کہ جو کسی قوم میں سمجھا جاتا ہو۔ لیکن دراصل اس کا نہ ہو۔ عرب شاعروں نے اسے اسی معنی میں باندھا ہے۔ یعنی جس کا نسب صحیح نہ ہو۔

تفسیر روح البیان میں ہے کہ "در تفسیر زاہد مذکور است کہ چون حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم این ایت در انجمن قریش بر ولید خواند بہر عیبی کہ رسید درخود باز یافت مگر حرام زادگی، با خود گفت من سید قریشم و پدر من مردی معروفست و میدانم کہ محمد دروغ نگوید چگونہ این مسئلہ را بر سر آرم بشمشیر کشیدہ نزد مادر آمد۔ المقصد بعد از تہدید بسیار ازو اقرار کشید کہ پدر تو در قصہ زنان جراتی نداشت و او را برادرزگان بودند چشم بر میراث وی نہادہ مرا رشک آمد۔ غلام فلان را بجز دیگر فتم و تو فرزند اویی و دلیل روشن برصدق قول نست خدمت خصومت ولیدست وستیزہ او باآن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔

(تفسیر روح البیان از شیخ اسمعیل حقی البروسی مطبوعہ استنبول۔ تفسیر سورۃ القلم صہ ۱۱۲)

علامہ سیوطی علامہ فخرالدین رازی اور طبری نے اپنی اپنی تفسیر

میں معمولی فرق کے ساتھ ایک ایسی روایت نقل کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے نسب کے معاملے میں کتنے حساس تھے۔ طبری کے مطابق "حضرت ابوہریرہ نے فرمایا کہ ایک دفعہ رسول اللہؐ تشریف لائے۔ آپؐ بہت غضب ناک تھے۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے تو ایک شخص آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور پوچھا کہ میرا باپ کہاں ہے؟ فرمایا جہنم میں۔ دوسرا کھڑا ہوا اور پوچھا میرا باپ کون تھا۔ فرمایا کہ تیرا باپ حذافہ تھا۔

پھر حضرت عمرؓ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ہم اللہ کو رب اسلام کو دین محمد کو نبی اور قرآن کو پیشوا ماننے پر راضی ہیں۔ یا رسول اللہ جاہلیت اور شرک کا زمانہ گزر گیا ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ ہمارے باپ دادا کون تھے چنانچہ آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔"

"اے ایمان والو! ان باتوں کو نہ پوچھو کہ اگر تم سے بیان کی جائیں تو تمہیں بری لگیں۔" (تفسیر طبری جلد نمبر ۷ مطبوعہ مصر صہ ۹۴)

ڈاکٹر خورشید احمد فارق نے اپنی کتاب "حضرت عمر کے سرکاری خطوط" میں عمروؓ عاص کا ایک خط درج کیا ہے۔ یہ خط حضرت عمرؓ کے عتاب نامہ کا جواب ہے۔ اس خط کی آخری چند سطریں بڑی معنی خیز ہیں، ملاحظہ ہو۔

"جتنی آپ نے میری سرزنش کی ہے۔ یثرب کے کسی یہودی کی بھی نہ کرتے، خدا مجھے اور آپ کو معاف کرے۔ مجھے آپ کی بہت سی باتیں معلوم ہیں۔ جن کا ذکر کر کے آپ کی توہین کر سکتا ہوں لیکن ایسا نہیں کروں گا۔" (عمرؓ فاروق کے سرکاری خطوط صہ ۲۸۹)

ڈاکٹر صاحب کے حوالاجات: ابن عبدالحکم ۱۵۹-۱۶۰ مقریزی، ۱/۱۳۶، حسن المحاضر ۱/۸۹، کنزالعمال ۳/۱۵۰

ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت عمر کے نسب میں خرابی کی وجہ سے ان کی عظمت گھٹانا صحیح بات نہیں ہے۔ ایام جاہلیت میں جناب رسول خدا کے گھرانے کے علاوہ بہت کم گھرانے ایسے ہوں گے جو نسبی عیوب سے پاک ہوں پھر یہ کہ اسلام میں بھی فضیلت، تقوے اور علم کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ علوے نسب اور اصالت نسب کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اعلیٰ نسبی کی وجہ سے بے جا فخر نہ کیا جائے۔ علم و عمل کو اصل فضیلت سمجھا جائے اور کسی شخص کو محض کم نسبی کی وجہ سے برا نہ سمجھا جائے۔

پیشہ :

حضرت عمرو بن العاص فرماتے ہیں: یوماکنت فیه والیالابن الخطاب واللہ لقدرأیته ورایت اباه وان علےکل واحد منھا عباءۃ قطرانیة مؤتزرا بھاما تبلغ ماءلبعض دکبیته وعلے عنق کل واحد منھاحزمة حطب وان العاص بن وائل لفی مزررات الدیباج۔

خدا اس دن پر لعنت کرے جب میں ابن خطاب کی طرف سے مصر کا گورنر مقرر کیا گیا۔ خدا کی قسم میں نے عمر کو بھی دیکھا ہے اور ان کے باپ کو بھی کہ ہر ایک کے جسم پر بھدے کپڑے کی ایسی مختصر عبا تھی جو ان کے گھٹنوں تک بھی نہیں پہنچتی تھی۔ اور اس وقت دونوں کے سروں پر جلانے کی لکڑیوں کا ایک گٹھر رہتا تھا۔ اس وقت میرا باپ ریشم و دیبا کی گھنڈیاں لگی ہوئی عبا استعمال کرتا تھا۔ (ازالۃ الخلفاء از شاہ ولی اللہ مقصد ۲ صہ ۱۸۳، سن اشاعت ۱۲۸۶ھ مطبع صدیقی بریلی)

اس عبارت کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر اور ان کے

والد خطاب کا پیشہ لکڑیاں کاٹ کر بیچنا تھا اور اس پیشہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ حضرت عمرو عاصؓ کے نزدیک حضرت عمرؓ کا خاندان انتہائی حقیر تھا۔

ایک مشہور روایت کے مطابق حضرت عمر اپنے والد خطاب کے اونٹ بھی چرایا کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں خطاب کے پاس کچھ اونٹ بھی تھے۔ بعض ایسی روایات بھی ملتی ہیں کہ خطاب دو پارٹیوں میں سودا کرایا کرتے تھے۔ ان روایات کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ خطاب نے مختلف اوقات میں مختلف پیشے اختیار کیے۔

باپ کی مفلوک الحالی کی وجہ سے عمرؓ کو بچپن ہی سے محنت مزدوری کرنا پڑی آپ خود فرماتے تھے کہ میری زندگی میں ایسا وقت بھی آیا ہے کہ جب گھر میں کھانے کو روٹی بھی نہیں ہوتی تھی اور میں اپنی خالاؤں کے گھر جا کر ان کا پانی بھرتا تھا تو وہ مجھے اس کے عوض کچھ کشمکش دے دیا کرتی تھیں۔

علامہ ابن ابی الحدید فرماتے ہیں کہ میں نے ابواحمد عسکری کی تصانیف میں سے ایک میں پڑھا کہ ایک دفعہ حضرت عمر ولید بن مغیرہ کے ساتھ بحیثیت خدمت گار اس کے تجارتی قافلہ میں شام گئے۔ وہاں آپ ولید کے اونٹ چراتے اور اس کا سامان اٹھاتے اور سامان کی حفاظت کرتے۔

یہ کہیں سے معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت عمر کو کبھی کسی بڑے تاجر کی حیثیت حاصل ہوئی ہو۔ سوائے اس کے کہ آپ گدھے بیچتے تھے یا اپنے والد خطاب کی طرح دو پارٹیوں میں سودا طے کرا کے کمیشن

وصول کرتے تھے۔ بعض کتابوں میں آپ کے تجارتی قافلوں کے ساتھ جانے کا ذکر تو ملتا ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کسی بڑے تاجر کی حیثیت سے جاتے تھے۔ یہ قیاس بھی کیا جا سکتا ہے کہ آپ کسی تاجر کے ذاتی ملازم کی حیثیت سے جاتے ہوں۔ بعض کتابوں میں دوران سفر بڑے بڑے لوگوں سے ملاقاتوں کا بھی تذکرہ ہے۔ تو اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کی یہ ملاقاتیں ایک تاجر کی حیثیت سے ہوتی تھیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تاجر حضرات بڑے لوگوں کے ہاں اپنا مال فروخت کرنے کے لئے جاتے ہوں اور حضرت عمرؓ بطور مزدور ساتھ جاتے ہوں۔ یہاں پر ہم حضرت عمرؓ کے سفر شام کا ایک واقعہ ازالۃ الخفاء سے پیش کرتے ہیں۔ جس سے صحیح صورت حال سمجھنے میں مدد ملے گی۔

"ابن عساکر نے بروایت زید بن اسلم لکھا ہے کہ وہ کہتے تھے حضرت عمرؓ بن خطاب نے ہم سے بیان کیا ہے کہ میں زمانہ جاہلیت میں بغرض تجارت قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ شام کی طرف گیا۔ پھر جب ہم وہاں سے فارغ ہو کر مکہ کی طرف چلے تو مجھے ایک کام یاد آیا تو میں پھر پیچھے لوٹ گیا اور میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں آکر تم سے مل جاؤں گا۔ پس میں شام کے ایک بازار میں جا رہا تھا۔ مجھے ایک بطریق (عیسائی پیشوا) ملا۔ جس نے میری گردن پکڑ لی، میں اس سے لڑنے لگا۔ بالآخر وہ مجھے اپنے گرجا میں لے گیا۔ وہاں کچھ مٹی کا ڈھیر تھا۔ مجھے اس نے ایک بیلچہ ایک پھاوڑا اور ایک ٹوکری دی اور کہا کہ اس مٹی کو یہاں سے ہٹا دے۔ یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا اور پھاٹک بند کرتا گیا۔ میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ پھر وہ دوپہر کے وقت میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تو نے کچھ بھی مٹی نہیں کھودی پھر اس نے ایک گھونسہ میرے

سر میں مارا۔ اب تو مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اس کے سر پر پھاوڑا (وغیرہ) دے مارا جس سے اس کا سر پھٹ گیا اور بھیجا اس کا نکل پڑا۔ اس کے بعد میں اسی وقت وہاں سے بھاگا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(اردو ترجمہ ازالۃ الخفاء، مقصد اول، از شاہ ولی اللہ ناشر محمد سعید اینڈ سنز کراچی، صفحہ ۸۴)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی وضع قطع ایسی تھی کہ وہ عیسائی عالم حضرت عمرؓ کو مزدور سمجھا ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ یہاں پر اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ حضرت عمرؓ کسی کے ملازم یا مزدور کی حیثیت سے تجارتی قافلوں کے ساتھ جاتے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ شاید کبھی کبھار کچھ اپنا سامانِ تجارت بھی لے جاتے ہوں۔ بہرحال یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ کو کسی بڑے تاجر کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔

ہم نے حضرت عمرؓ کے خاندان اور پیشہ کے بارے میں صحیح صورتِ حال پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب ہم حضرت عمرؓ کے اس خاندانی عہدے کا ذکر کرتے کہ جس کی اچھی خاصی شہرت ہے۔ یعنی عہدہ سفارت۔ ہمارے محققین ان عہدوں کے بارے میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ جیسے ایام جاہلیت میں بھی مکہ میں کوئی باقاعدہ حکومت قائم تھی اور اس کے باقاعدہ صیغے تھے۔ حالانکہ اس وقت کے عرب کا معاشرہ انتہائی سادہ و آزاد تھا اور مختلف قبائل اس کی اکائیاں تھیں۔ آج کل کچھ یہ دستور چل نکلا ہے کہ انتظامیہ کی جدید اصطلاحات کا اطلاق اس سادہ معاشرے پر اس طرح کیا جاتا ہے کہ گویا وہ بھی آج کی طرح پیچیدہ اور منظم معاشرہ تھا دراصل اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ جدید دور کے تعلیم یافتہ لوگوں کو بعض

شخصیتوں کا وہ تصور دیا جائے کہ جس سے وہ ان کی عظمتوں پر یقین کر سکیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ سوائے تولیت کعبہ کے چند شعبوں کے کسی شعبہ کا وجود کسی تاریخی ماخذ سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور تولیت کعبہ میں بنو عدی کا کبھی کوئی حصہ نہیں رہا۔ صرف "عقد فرید" میں حضرت عمرؓ کی سفارت کا معمولی سا تذکرہ ہے نہ کہ کسی موروثی عہدہ کی طرح۔ عقد فرید کی یہ چند سطریں صحیح صورت حال سامنے لانے کے لئے کافی نہیں۔

ومن بن عدی عمر بن الخطاب وکانت الیه السفارة فی الجاهلیة وذالك انهم کانوا اذا وقعت بینهم وبین غیرهم حرب لعثوه سفیرا وان نافوهم حی المفاخرة جعلوه منافرا و رضوا به۔

خاندان بنو عدی میں سے عمر بن خطاب تھے کہ جن کے ذمہ زمانہ جاہلیت میں سفارۃ کا کام تھا۔ جب ان میں اور ان کے غیر میں کوئی جنگ ہوتی تو انہیں سفیر بنا کر بھیجا جاتا۔ اگر کوئی ان سے مفاخرۃ منافرۃ کرتا تو انہی کو مقابلے پر بھیجا جاتا اور لوگ انہی پر راضی ہوتے۔

(عقد فرید جلد ۲ صہ ۳۸)

حضرت عمرؓ کو جنگ کے موقعہ پر سفیر بنانے کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ آپ کو بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور بڑا صاحب تدبر شخص سمجھا جاتا تھا۔ ایسے سفیر کی حیثیت تو محض ایک قاصد کی ہوتی تھی کہ جو جنگ پر آمادہ، غصہ میں بھرے ہوئے لوگوں کا پیغام مخالف کے پاس لے جائے۔ جو شخص جنگ کے لئے نکلتا وہ تو غیرت کے مارے اس پیغام رسانی کے لئے تیار نہ ہوتا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ جنہیں جنگ سے دلچسپی نہیں تھی اور تھے بھی بڑے ڈیل ڈول کے آدمی اس خدمت کے لئے موزوں شخص

تھے۔ تلوار کے علاوہ زبان کی بھی جنگ ہوتی جس میں ایک فریق دوسرے فریق کے مقابلے میں اپنی فضیلت بیان کرتا اور دوسرے کی تذلیل کرتا۔ چنانچہ یہ کام بھی حضرت عمر سے لیا جاتا۔ اپنے بارے میں ڈینگیں مارنا اور دوسروں کو کمتر گرداننا کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے۔ مگر اسے حضرت عمرؓ کی خاطر قابلِ فخر بنا دیا گیا۔ اور ان خدمات کو "سفارت" کا نام دیا گیا۔

قبولِ اسلام

حضرت عمر کئی سال تک پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن بنے رہے۔ قلب کی سختی باپ سے ورثہ میں ملی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ مجبور عورتوں تک پر رحم نہ آتا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب الفاروق میں لکھتے ہیں کہ "لبنیہ ان کے خاندان میں ایک کنیز تھی، جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس کو بے تحاشہ مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے ذرا دم لے لوں تو پھر ماروں گا۔" ذرا غور تو کیجئے کہ ایک لحیم شحیم جوان آدمی ایک کمزور عورت کو اتنا مارتا ہے کہ تھک جاتا ہے تو اس مار کھانے والی کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔

حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ رسولؐ اللہ نے دعا فرمائی تھی کہ اے خدا عمر ابن خطاب یا ابوجہل ابن ہشام کے ذریعہ اسلام کو تقویت پہنچا۔ رسولؐ اللہ کے دل میں ان ظالموں کے لئے یہ خواہش پیدا ہونا ایک فطری بات ہے۔ یقیناً آپ سوچتے ہوں گے کہ کسی صورت کم از کم ان ماموں بھانجے میں سے کسی ایک ہی سے نجات مل جائے تاکہ دوسرا شاید خود نرم پڑ جائے۔ ظاہر ہے کہ نجات کے دو ہی راستے تھے کہ یا تو پیغمبرِ اسلام ان کے مرنے کی خواہش کرتے اور یا ان کے اسلام

لانے کی۔ آنحضرتؐ جیسی شخصیت کے بارے میں یہ تو سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ آپ اپنے دشمن کی بھی موت کی آرزو کریں گے کہ اس سے نجات ملے۔ تو صرف ایک یہی بات رہ جاتی ہے کہ آپ ان دونوں کے ظلم و تشدد کی باتیں سنتے ہوں تو کبھی کبھی بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہو کہ اے اللہ انہیں اسلام کی توفیق عطا فرما۔ راویوں نے اس بات کو باقاعدہ دعا کا رنگ دے دیا۔ اور عقیدت مند اس دعا کی بنیاد پر حضرت عمر کو مراد رسولؐ کہنے لگے اور اسے بڑی فضیلت کی طرح بیان کرنے لگے۔ حالانکہ فضیلت کی بات تو تب ہوتی کہ جناب رسول خدا کسی ایسے شخص کے بارے میں دعا فرماتے کہ جو اپنی رحمدلی اور دوسری اعلیٰ اخلاقی صفات کی وجہ سے مشہور ہوتا۔

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بارے جو قصہ مشہور ہے اسے الفاظ کی تھوڑی سے الٹ پھیر اور کمی بیشی کے ساتھ مختلف راویوں نے بیان کیا ہے اور مسلمان بالعموم اسی واقع پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم اس واقعہ کو ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب "الشیخان" کے اردو ترجمہ سے نقل کر رہے ہیں۔

ایک دن حضرت عمرؓ اپنے سینے سے تلوار لٹکائے ہوئے غیظ و غضب سے مملو انتقام کے جذبات سے پر نکل کھڑے ہوئے۔

بنی زہرہ کے کسی آدمی نے پوچھا! کدھر چلے عمرؓ، جواب ملا محمدؐ کے قتل کے ارادے سے نکلا ہوں!

پوچھنے والے نے پھر کہا، محمد کو قتل کردو گے تو کیا بنی ہاشم اور بنی زہرہ تمہیں چھوڑ دیں گے اب (اب اس مضحکہ خیز روایت کی رو جس کا قبول کرنا از روئے منطق مستبعد ہے) گویا حضرت عمر نے کہا ایسا معلوم پڑتا ہے کہ تم نے اپنا پرانا مسلک چھوڑ دیا ہے؟ اس آدمی نے کہا: لیکن میں اس سے زیادہ حیرت کی بات بتا دوں تو...... تمہارے بہنوئی اور بہن بھی تو اپنے

پچھلے دین کو چھوڑ چکے ہیں۔ اپنے آبا و اجداد کے دین کو! اب عمر کا چہرہ متغیر ہو چکا تھا اور وہ انتہائی غیظ کے عالم میں اپنی بہن کے گھر پہنچتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہی آپ کو احساس ہوا کہ جیسے گھر میں کچھ پڑھا جا رہا ہے۔ اس وقت حضرت عمر کی ہمشیرہ اور بہنوئی کے پاس ایک مسلمان "خباب بن الارت" بھی موجود تھے۔ خباب نے عمر کی آہٹ پا کر اپنے آپ کو چھپا لیا۔

یہ کیا بکواس تھی جو میں سن رہا تھا؟ تند خو بھائی گرجا' ہم لوگ کبھی کبھی ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اور کیا! بہن نے جواب دیا۔" نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ اپنے دین سے ہٹ گئے ہو" حضرت عمرؓ بولے۔ یہاں پر حضرت عمرؓ کے بہنوئی بول اٹھے۔ اور اگر جسے تم حق سمجھ رہے ہو وہی ناحق ٹھہرے تو۔ اب حضرت عمرؓ قابو سے باہر ہو چکے تھے اور اب انہوں نے اپنے بہنوئی پر جھپٹ کر انہیں مارنا شروع کر دیا تھا! بہن نے چاہا کہ بھائی اور شوہر کے بیچ میں حائل ہو جائیں۔ لیکن بھائی نے بہن کو بھی مارنا شروع کر دیا۔ بہن کا چہرہ لہولہان ہو چکا تھا۔ اس پر بہن نے اپنے نئے عقائد کا اعلان کر دیا اور کہا۔ ہم لوگ اب صرف اللہ کو معبود سمجھتے ہیں اور محمدؐ کو اس کا برحق رسول اور پیغمبر۔ حضرت عمر کی نظر انکے کے خون آلودہ چہرہ پر پڑ گئی۔ ان کا دل پسیجا اور انہوں نے اس صحیفہ کا مطالبہ کیا۔ جس سے کچھ پڑھا جاتے ہوئے آپ نے سنا تھا۔ (سوال یہ ہے کہ گھر کے باہر حضرت عمرؓ نے کچھ پڑھے جانے کی آواز ضرور سنی تھی۔ لیکن صحیفے کے بارے میں انہیں کیسے علم ہو گیا۔ پھر اس وقت صحیفہ یا کاغذ کا سوال بھی تو پیدا نہیں ہوتا تھا۔) اب راویوں نے مزید گل کھلائے ہیں۔ ان کے بزعم، خواہر عمر نے صحیفہ دینے سے انکار کرتے ہوئے گویا یہ کہا کہ

تم نجس ہو اور قرآن کو صرف طیب اور طاہر لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ انہیں اس بات کی ہدایت کی کہ پہلے وہ پاک ہولیں تو پھر صحیفہ کو چھوئیں۔ حضرت عمر نے ایسا ہی کیا۔ (عجیب بات ہے، نجاست کا الزام اور وہ بھی بہن سے سننے کے بعد حضرت عمر مزید مشتعل نہ ہوئے اور وہی عمر جو ابھی ابھی بہن اور بہنوئی کو ہلاک کئے دے رہے تھے کہیں حمام پہنچ گئے کہ کپڑے تبدیل کر آئیں!) بعض بزرگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اب چند لمحات پیشتر کے خونخوار اور تندخو حضرت عمر غسل اور وضو کے بعد پلٹے تو انہیں سورہ طٰہٰ کی چودہویں آیت سنائی گئی۔ جس کا مطلب ہے۔

"بے شک میں ہی خدا ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میری عبادت کیا کرو۔" یہ آیات قلب عمرؓ کی گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ فوراً فرمایا۔ مجھے محمدؐ تک لے چلو۔ یہ بات جناب نے (جو گھر میں کہیں دبکے بیٹھے تھے) سن لی اور اپنی جگہ سے نکل آئے اور کہا۔" عمر میں تمہیں یہ مژدہ سناتا ہوں کہ شاید رسول اللہ کی دعا قبول ہو چکی ہے۔ رسول اللہ کی دعا یہ دہائی ہے کہ اے اللہ اسلام کو عمر بن الخطاب یا عمرو ابن ہشام سے تقویت بخش دے۔ جو بھی ان دونوں میں تیرے لئے محبوب ہو۔"

راوی لکھتے ہیں! حضرت عمر ارقم کے مکان پر جہاں آنحضرت اپنے جانثاروں کے ساتھ تشریف فرما ہوتے رہتے تھے وارد ہوئے۔ مکان کے دروازے پر پہلے ہی سے کچھ لوگ موجود تھے۔ حضرت عمر کو دیکھ کر سب کے سب کانپ سے اٹھے۔ انہیں میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب بھی تھے۔

اس موقع پر حضرت حمزہؓ نے لوگوں سے کہا۔ یہ صحیح ہے کہ عمر آرہے ہیں۔ لیکن اگر وہ آ بھی رہے ہیں تو بھی کیا، اب اگر اللہ کو بھلائی منظور ہے تو کیا کہنا۔ ورنہ ہم لوگ مل کے انہیں قتل تو کر ہی سکتے ہیں۔ راوی بیان

کرتے ہیں (حضرت عمر کی آمد کے بارے میں سن کر) آنحضرت باہر نکل آئے آپ نے سختی کے ساتھ حضرت عمر کے دامن کو کھینچنا شروع کیا اور فرمانا شروع کیا۔" عمر کیا تم اپنی موجودہ روش سے باز نہ آؤ گے۔ کیا تمہیں ولید بن مغیرہ کا انجام ذلت منظور ہے ۔ اے اللہ اب جبکہ خطاب کا فرزند عمر یہاں آچکا ہے اس کے ذریعہ اسلام کو تقویت بخش۔

حضرت عمرؓ نے فوراً کہا۔ میں اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔"

میں جب ان روایات کو بیان کرتا ہوں۔ تو انہیں قابلِ اعتبار نہیں سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ ہے کہ ان روایات سے مجھے اور اس کتاب کے قاریوں کو اس کا ضرور اندازہ ہو جائے گا کہ قدماء اور اصحاب رسول کے ذہنوں میں قبل از اسلام والے عمر کی تند خوئی کس درجہ کی تھی۔ ایک بات جو بالکل یقینی ہے۔ یہ ہے کہ حضرت عمر (اسلام لانے سے پہلے پہلے) مسلمانوں کے حق میں بہت سخت اور شعلہ مزاج تھے۔ ممکن ہے آپ نے اس دور میں قرآن کی آیتیں سنی ہوں اور ان سے اتنا اثر لیا ہو کہ مشرف بہ اسلام ہو گئے ہوں۔

(ابو بکر صدیق اور فاروق اعظم از ڈاکٹر طٰہٰ حسین
نفیس اکیڈمی صفحہ ۱۱۸)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین (مصری) کی رائے حضرت عمرؓ کے قبول اسلام والی روایت کے بارے میں آپ نے پڑھی۔ یقیناً یہ روایت عقلاً قابل قبول نہیں۔ مسلمانوں کا انتہائی بے رحم دشمن۔ انتہائی سخت دل انسان جو کہ پیغمبر اسلام کو قتل کرنے کی نیت سے نکلتا ہے۔ راستہ میں بہن اور بہنوئی کے اسلام کے بارے میں سنتا ہے تو انہیں لہو لہان کر دیتا ہے۔ مگر محض

یہ پڑھ کر کہ "بے شک میں خدا ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو میری عبادت کیا کرو۔" چند لمحوں میں ایک نیا مذہب قبول کرنے پر تیار ہو جاتا ہے یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ تو سنا ہے کہ کوئی چور ڈاکو کسی عبرت ناک واقعہ کو دیکھتا ہے یا کوئی ایسی بات سنتا ہے اور اس کی دنیا بدل جاتی ہے اور وہ اپنے گناہوں سے توبہ کر کے شریفانہ زندگی گذارنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ مگر کوئی نیا مذہب قبول کرنے کی بات اور ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سے پہلے کبھی آپ نے قرآن کی کوئی آیت نہیں سنی تھی، یقیناً بہت سی آیات سنی ہوں گی تو پھر ان سیدھی سادی آیات میں کیا خاص بات تھی اور کون سا خاص ماحول تھا کہ جس کی وجہ سے آپ چند لمحوں میں ایک نیا مذہب قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ کئی سال تک تحریک اسلامی کا جائزہ لیتے رہے اور خوب سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا۔ ہم اس موقع پر عیسائی عالموں کی پیشین گوئی کو بھی اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کی نذر کرتے ہیں۔

"الغرض میں اس دن کا باقی حصہ اور پوری رات چلتا ہی رہا۔ صبح ہوتے ایک دیر کے پاس پہنچا اور اس کے سائے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس دیر سے ایک شخص نکلا اور اس نے مجھ سے کہا کہ اے بندۂ خدا تو یہاں کیوں آیا ہے۔ میں نے کہا میں اپنے ساتھیوں سے جدا ہو کر راستہ بھول گیا ہوں۔ پھر وہ میرے لئے کھانا اور پانی لے آیا اور ایک مرتبہ نیچے سے اوپر تک مجھے بغور دیکھا۔ بعد اس کے کہنے لگا اے شخص تمام اہلِ کتاب جانتے ہیں کہ اب روئے زمین پر کوئی مجھ سے زیادہ کتاب الٰہی کا عالم نہیں ہے اور میں (اپنے علم سے) تجھ کو وہی شخص سمجھتا ہوں جو ہم کو اس دیر سے نکالے گا اور اس شہر پر قابض ہو گا۔ میں نے اس سے کہا کہ صاحب آپ

توکہیں اور چلے گئے۔ اس نے پوچھا تمہارا کیا نام ہے؟ میں نے کہا عمر بن خطاب (یہ سنتے ہی) اس نے کہا خدا کی قسم تم وہی شخص ہو کچھ شک نہیں۔ اچھا اس دیر کا اور جو کچھ از قسم اراضی و اموال اس میں ہے اس کا معافی نامہ تو ہمیں لکھ دو۔ میں نے کہا۔ صاحب آپ نے میرے ساتھ ایک احسان کیا ہے اب اس کو اس طرح نہ مٹائیے۔ اس نے کہا ایک کاغذ لکھ دو۔ تمہارا اس میں کیا نقصان ہے۔ اگر تم وہی شخص ہو تو تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا اور اگر تم وہ شخص نہیں ہو تو یہ تحریر تمہیں کچھ ضرر نہ دے گی۔ میں نے کہا اچھا لائیے لکھ دوں، چنانچہ ایک تحریر میں نے اس کو لکھ دی اور اس پر مہر بھی کر دی (حضرت ابوبکرہ راوی روایت کرتے ہیں کہ) پھر جب حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے زمانہ میں شام تشریف لے گئے تو وہ راہب آپ کے پاس وہی تحریر لایا۔ اور وہ راہب دیر قدس کا متولی تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس تحریر کو دیکھ کر تعجب کیا اور اس وقت انہوں نے یہ سب واقعہ ہم لوگوں سے بیان کیا۔ اس راہب نے آپ سے کہا کہ اب میرا وعدہ پورا کیجئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ میں اس وعدہ کو کیسے پورا کر سکتا ہوں۔ بیت المقدس میں کچھ بھی حصہ نہ تو عمر کا ہے نہ عمر کے بیٹے کا۔ عمر یہاں کا مالک نہیں بلکہ خدا کی طرف سے متولیانہ قبضہ رکھتا ہوں۔

اور ابن سعد نے حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ (ایک مرتبہ) حضرت عمرؓ گھوڑا دوڑاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ یکایک ان کی ران قباء کے نیچے سے کھل گئی۔ اہل نجران نے (جو کہ نصرانی تھے) دیکھا کہ ان کی ران پر سیاہ تل ہے۔ کہنے لگے کہ یہی وہ شخص ہے۔ جس کے متعلق ہم اپنی کتاب میں دیکھتے ہیں کہ وہ ہم کو ہمارے ملک سے نکالے گا۔

(اردو ترجمہ ازالۃ الخفاء از شاہ ولی اللہ دہلوی مقصد اول)

حضرت عمرؓ کا تاخیر سے اسلام قبول کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے خوب سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا اور ہو سکتا ہے کہ عیسائی عالموں کی ان پیشین گوئیوں کا بھی اس میں کچھ دخل ہو۔ آپ نے رسول اللہ کی شخصیت اور تحریک اسلامی کے گہرے مشاہدہ سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ یہ تحریک ایک نہ ایک دن ضرور غلبہ پائے گی۔ لہٰذا آپ سوچ سمجھ کر اس میں شامل ہوئے اور تہلکہ مچا دینے کے انداز سے شامل ہوئے۔ کلمہ پڑھ لینے کے فوراً بعد ایسے شخص کے متلاشی ہوئے کہ جو آپ کے اسلام کا ڈھنڈورا پیٹ دے۔

شاہ ولی اللہ ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں کہ "مولیٰ عبداللہ محمد بن اسحٰق ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر فاروق اسلام قبول کر چکے تو آپ نے کہا کہ کون شخص قریش کی خبریں ادھر ادھر پہنچایا کرتا ہے۔ کہا گیا جمیل بن معمر ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ صبح آپ اس کے پاس گئے۔ میں بھی آپ کے پیچھے گیا کہ دیکھوں آپ کیا کرتے ہیں۔ میں اس وقت گو لڑکا تھا۔ مگر جو کچھ میں دیکھتا اسے سمجھ سکتا تھا۔ آپ نے جاتے ہی اس سے کہا۔ جمیل تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں قبول دین اسلام کر کے دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوں۔ آپ کے کہنے کی دیر تھی کہ جمیل اپنا چادر کھینچتا ہوا اٹھا اور میرے والد عمر فاروق اس کے پیچھے ہوئے۔ یہاں تک کہ مسجد الحرام کے دروازے پر آیا اور چلا کر کہا کہ عمر بن خطاب تو بے دین ہو گیا ہے۔ حضرت عمر فاروق نے بجواب اس کے کہا یہ جھوٹا ہے بلکہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور کلمۂ شہادت اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمد عبدہ ورسولہ پڑھ لیا۔ بس یہ کہا کہ قریش آپ کی طرف دوڑ پڑے اور آپ ان سے لڑتے رہے یہاں تک کہ آفتاب سروں پر آ گیا۔ پھر آپ تھک کر بیٹھ گئے اور قریش آپ کے سر پر کھڑے رہے۔ آپ ان سے کہتے جاتے تھے۔ اب جو تمہارا دل چاہے کر دیا

قسمیہ کہتا ہوں کہ اگر ہم تین سو شخص بھی ہوتے یا تو ہم شہر سے نکل جاتے یا تمہیں نکال دیتے۔ اس اثنار میں یہاں سے ایک پیر مرد گذرے دریافت کرنے لگے کہ کیا معاملہ ہے۔ ان لوگوں نے کہا۔ عمر بے دین ہو گیا ہے۔ پیر مرد نے کہا پھر کیا ہوا ایک نے اپنے لئے ایک دین اختیار کر لیا۔ تم کیوں اس سے تعرض کرتے ہو کیا تم خیال کرتے ہو کہ بنی عدی ان کو تمہارے لئے چھوڑ دیں گے۔ چھوڑو اسے جانے دو۔ چنانچہ قریش آپ کے پاس سے ہٹ گئے۔ جب آپ مدینہ طیبہ ہجرت کرنے لگے تو میں نے پوچھا کہ وہ پیر مرد کون تھے۔ جنہوں نے قریش کو ڈانٹا تھا۔ جب کہ آپ کے اسلام پر وہ آپ سے لڑ رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ عاص بن وائل سہمی تھے۔

(اردو ترجمہ ازالۃ الخفاء ناشر محمد سعید اینڈ سنز کراچی مقصد دوم صفحہ ۷۵)

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد کا یہ واقعہ ہر ایک نے لکھا ہے۔ یہ حضرت عمر کا ڈرامائی انداز تھا۔ اس سے آپ کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں پر اپنی دھاک بٹھانا چاہتے تھے اور پہلے ہی دن سب کو متاثر کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے بھی چالیس پچاس پانچ افراد اسلام لا چکے تھے جن میں حضرت حمزہ جیسا بہادر عم رسول بھی تھا۔ حضرت عمر کو اپنے اس ڈرامائی انداز کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ آپ بری طرح سے زدوکوب کئے جاتے ہیں یہاں تک کہ عاص بن وائل آپ کو اس نرغہ سے چھڑاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کے اسلام قبول کر لینے سے مسلمانوں کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ اور وہ خانہ کعبہ کے قریب جا کر نماز ادا کرنے لگے اور یہ بات کچھ اس طرح سے کہی جاتی ہے کہ گویا حضرت عمرؓ کا اتنا رعب تھا اور کسی طاقتور قبیلہ سے تعلق تھا کہ مسلمان کھل کر کعبہ کے قریب نماز ادا کرنے لگے اور کسی میں دم مارنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حالانکہ جب آپ نے اپنے قبول

اسلام کا ڈھنڈورا پٹوایا تو خود اتنی مار کھائی کہ جان پر بن گئی۔ اور بچایا بھی تو سہمی قبیلے کے ایک سردار نے خود آپ کا قبیلہ تو اتنا کمزور تھا کہ وہ مستقل بنو سہم کی پناہ میں تھا۔

حضرت عمرؓ سے عقیدت کی وجہ سے سبکو یہ پہلو تو نظر آیا کہ حضرت عمرؓ نے بڑی جگری سے اپنے نئے مذہب کا اعلان کیا اور مسلمانوں کو جوش دلا کر کھلم کھلا خانہ کعبہ کے نزدیک نماز ادا کروا دی۔ مگر اس کے نتائج پر نظر نہیں گئی۔ اب تک مسلمان بڑی احتیاط اور بردباری سے کام کر رہے تھے تو دشمن کے شر سے نسبتاً محفوظ تھے، مگر تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس ڈرامائی انداز کی وجہ سے رسُول اللہ اور مسلمان بڑی مصیبت میں پڑ گئے۔ کفار مکہ کے غیظ وغضب میں اس درجہ اضافہ ہوا کہ انہوں نے مسلمانوں کا سوشل بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاریخوں میں ہے کہ یہ فیصلہ حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے بعد کیا گیا اور باقاعدہ ایک معاہدہ تحریر کیا گیا کہ جس کی رو سے کوئی شخص بھی بنو ہاشم سے شادی بیاہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی قسم کے لین دین کی اجازت تھی۔ چنانچہ جناب ابوطالب بنو ہاشم کو لیکر شعب ابی طالب میں چلے گئے۔

بنو ہاشم پر یہ مصیبت بڑی شدید تھی۔ یہ صرف حج کے زمانہ میں شعب کے باہر آتے اور خرید و فروخت کر کے پھر شعب میں چلے جاتے اور پھر باہر آنے کے لئے آئندہ حج کا انتظار کرتے۔ اس دوران اشیاء ضرورت کی شدید قلت ہو جاتی۔ غذا کی اتنی کمی ہو جاتی کہ درختوں کے پتے کھانے پڑتے۔ اگر کوئی ہمدرد چھپے چوری کچھ پہنچا دیتا تو اسے شدید باز پرس کا سامنا کرنا پڑتا۔ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں کہ اس تمام عرصے میں حضرت عمرؓ کہیں نظر نہیں آتے۔ کیا ان کا کام مسلمانوں کو کعبہ کے نزدیک نماز پڑھوا کر ختم ہو گیا تھا۔ آج اس بات کا کتنا چرچا ہے کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لاتے ہی اسلام کو تقویت

ملی۔ آپ مرادِ رسول تھے۔ اگر مرادِ رسول ہوتے تو قدم قدم پر نصرت رسول کرتے مگر ہوا یہ کہ کعبہ کے نزدیک نماز پڑھوا کر تاریخ کے صفحات سے ایسا غائب ہوئے کہ پھر ہجرت کرتے نظر آتے ہیں سات سال تک رسول اللہ کی کیا خدمت کی۔ اسلام کو کیسے تقویت پہنچائی۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ حالانکہ شعب ابی طالب سے رہائی کے بعد بھی رسول اللہ اور مسلمانوں کو سکون نصیب نہیں ہوا۔ بلکہ جناب ابو طالب کی وفات کے بعد تو مصائب اس حد تک بڑھ گئے کہ مکہ رہنے کے قابل نہ رہا۔ مگر حضرت عمرؓ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ آپ کی گذر بسر کیسے ہو رہی تھی مگر جیسے ہی ان مسلمانوں کو کہ جو شدید مصائب کا شکار تھے مدینہ ہجرت کا حکم ہوا تو حضرت عمرؓ اپنے بیس احباب و اقرباء کے ہمراہ مدینہ سے ہجرت کر گئے۔ حالانکہ حکم صرف ان لوگوں کے لئے تھا کہ جن کے لئے کفار سے نجات کی کوئی صورت نہیں تھی۔

عمرؓ مدینہ میں

شاہ ولی اللہ دہلوی ازالۃ الخفاء میں براء بن عازب سے روایت کرتے ہیں کہ "سب سے پہلے جو لوگ ہمارے پاس ہجرت کرکے آئے وہ مصعب بن عمر اور ابن ام مکتوم تھے اور یہ ہمیں تعلیم قرآن دینے کے لئے آئے ہوئے تھے اور پھر حضرت عمرؓ فاروق بیس افراد کی ہمراہی میں۔" حضرت عمرؓ نے ہجرت کے بعد قباء میں قیام فرمایا۔ یہ مقام مدینہ سے دو تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

رشتہ اخوت :

جب رسول اللہ خود ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تو آپ نے مسلمانوں کے درمیان رشتہ اخوت قائم کیا۔ پہلے جب مہاجرین کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا تو حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ کا بھائی بنایا اور جب مہاجر و انصار کے درمیان اخوت قائم کیا تو حضرت عمرؓ کو عتبان بن مالک کا بھائی بنایا۔ جناب رسول خدا نے ان رشتوں کے قیام میں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا کہ صرف ہم رتبہ افراد کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا جائے۔

ہجرت کے بعد حضرت عمر نے تجارت کو ذریعہ معاش بنایا اور قبا ہی میں قیام پذیر رہے۔ یہ سلسلہ آپ کی خلافت کے زمانے تک قائم رہا۔ تجارت ،

مصروفیات کے باعث آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بہت کم حاضر ہوتے۔ تجارت کے علاوہ معاش کا ذریعہ وہ جاگیریں تھیں کہ جو رسول اللہ نے آپ کو عطا کیں۔ آپ کا زیادہ تر وقت اپنی ذاتی مصروفیات میں گزرتا۔

دینی اور انتظامی خدمات :

رسول اللہ کے دور میں ریاست کی حدود کافی پھیل گئیں۔ تو آپ نے بہت سے عہدے بنائے۔ ان عہدوں اور عہدیداروں کا ذکر سیرت النبیؐ (شبلی نعمانی) جلد ۲ میں تفصیل سے درج ہے اور اس کے مطابق :

دعاۃ :

جنہیں اسلام کی تبلیغ کے لئے مدینہ کے باہر بھیجا جاتا تھا۔ ان دعاۃ کی فہرست میں کہیں حضرت عمر کا نام نہیں ہے۔

عمال برائے وصولیابی زکوٰۃ و جزیہ :

جو علاقے زیر اثر آتے۔ وہاں ان محصولات کی وصولیابی کے لئے عمال مقرر کئے جاتے۔ یہ عمال تبلیغ اسلام کا کام بھی انجام دیتے۔ حضرت عمرؓ کا نام اس فہرست میں بھی نہیں ہے۔ مگر ۹ھ کو آنحضرت صلعم نے صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے بہت سے حضرات کو مختلف قبیلوں اور شہروں میں بھیجا اور حضرت عمر کا تقرر مدینہ میں کیا۔ سیرت النبیؐ کے مطابق یہ ایک وقتی انتظام تھا۔

قضاۃ :

کبھی کبھی فصل مقدمات کرنے والے حضرات کی فہرست میں حضرت عمرؓ کا نام موجود ہے۔ مگر آپ کہیں باقاعدہ قاضی بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ جیسا کہ حضرت علی اور معاذ بن جبل کے بارے میں درج ہے۔

کتابت

کتابت کی خدمات انجام دینے والوں کی طویل فہرست میں آپ کا نام تو

موجود ہے۔ مگر آپ نے یہ خدمت ایک آدھ بار ہی انجام دی ہوگی۔ کیونکہ اس فہرست کے اخیر میں یہ وضاحت کردی گئی ہے کہ عام طور پر یہ خدمت حضرت زید بن ثابت انجام دیتے تھے۔

حاکم ووالی :

اس طویل فہرست میں بھی آپ کا نام نہیں ہے۔

پولیس :

سیرت النبیؐ کے مطابق آنحضرت صلعم کے دور میں اس کا ابتدائی نمونہ قائم ہوچکا تھا اور اس کے ذمہ دار قیس بن سعد تھے۔

جلاّد :

مجرموں کی گردن مارنے کی خدمت پر معمور حضرات میں بھی حضرت عمر کا نام موجود نہیں ہے۔

جنگی خدمات :

اب رہ گئیں جنگی خدمات تو یہ دو طرح کی تھیں ایک وہ جس میں خود رسول اللہ شریک ہوتے جسے غزوہ کہا گیا اور دوسری وہ کہ جس میں رسول اللہ خود شریک نہیں ہوتے۔ جسے سریہ کہا گیا۔ عام طور سے سریہ چھوٹی چھوٹی مختلف النوع فوجی مہمیں ہوتی تھیں کہ جو کسی صحابی کی سرکردگی میں روانہ کی جاتی تھیں۔

غزوات کے بارے میں مورخ طبری لکھتا ہے۔

"ابوجعفر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے چھبیس غزوات میں خود شرکت فرمائی ہے۔ جن لوگوں نے آپ کے غزوات کی تعداد چھبیس بیان کی ہے۔ انہوں نے غزوہ خیبر اور وہاں سے جو آپ مدینہ واپس آتے بغیر غزوہ وادی القریٰ کے لئے گئے تھے۔ ایک غزوہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ ایک ہی سلسلہ میں ہوتے۔ اس لئے آپ اپنے مقام پر واپس آتے۔ بغیر خیبر ہی سے

وادی القریٰ چلے گئے۔ اور جو لوگ آپ کے غزوات کی تعداد ستائیس کہتے ہیں وہ ان دونوں واقعوں کو علیحدہ علیحدہ ایک غزوہ سمجھتے ہیں۔

عبداللہ بن ابی بکر سے مروی ہے کہ کل چھبیس غزوات ایسے ہیں جن میں رسول اللہ صلعم نے بذات خود شرکت فرمائی ہے۔ پہلا غزوہ جس میں آپ نے شرکت کی وہ غزوہ ودان ہے اور یہی غزوۃ الابواء ہے۔ اس کے بعد غزوہ بواط ہے۔ جو کوہ رضویٰ کی سمت میں پیش آیا۔ پھر غزوۃ العشیر جو ینبوع کے شکم میں وقوع پذیر ہوا۔ اس کے بعد بدر کا پہلا غزوہ ہے جس میں آپ کرز بن جابر کے تعقب میں گئے تھے۔ اس کے بعد بدر کا وہ غزوہ ہوا جس میں قریش کے عمائد اور اشراف مارے گئے اور اسیر کئے گئے۔ اس کے بعد بنی سلیم کا وہ غزوہ ہوا جس میں آپ الکدر تک پہنچے تھے۔ جو بنی سلیم کا ایک چشمہ ہے اس کے بعد غزوۃ السویق ہوا جس میں آپ ابوسفیان کے تعقب میں قرقرۃ الکدر تک پہنچے تھے۔ اس کے بعد غزوہ غطفان ہوا جس میں آپ نے نجد کی طرف یورش کی تھی۔ اور اس کو غزوہ ذی اقر بھی کہتے ہیں۔ اس کے بعد غزوہ نجران ہے یہ فرع کے اوپر حجاز میں ایک کان ہے۔ اس کے بعد احد کا غزوہ ہے۔ اس کے بعد حمراء الاسد کا غزوہ ہوا۔ اس کے بعد بنی النضیر کا غزوہ ہوا۔ اس کے بعد نخلستان ذات الرقاع کا غزوہ ہوا۔ اس کے بعد بدر کا دوسرا غزوہ ہوا۔ اس کے بعد غزوہ دومۃ الجندل اس کے بعد غزوۂ خندق ہوا۔ اس کے بعد قریظہ کا غزوہ ہوا۔ اس کے بعد خزاعہ کے بنی مصطلق سے غزوہ ہوا۔ اس کے بعد غزوہ حدیبیہ ہوا۔ اس میں آپ کا ارادہ لڑائی کا نہ تھا اور مشرکین نے آپ کو مکہ جانے سے روک دیا۔ اس کے بعد غزوہ خیبر ہوا۔ اس کے بعد آپ عمرہ کی قضا کے لئے مکہ گئے۔ اس کے بعد فتح مکہ کا غزوہ ہوا۔ اس کے بعد غزوہ حنین، اس کے بعد غزوہ طائف، اس کے بعد

غزوہ تبوک ہوا۔ ان غزوات میں سے غزوات بدر، احد، خندق۔ قریظیہ
مصطلق، خیبر، حنین اور طائف ایسے ہوئے کہ ان میں خود رسول اللہ صلعم
نے لڑائی میں حصہ لیا۔

محمد بن عمر کو ابو حثمہ سے جو روایت پہنچی ہے۔ وہ مذکورہ بالا بیان
کے مطابق ہے۔ مگر وہ خود کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کے مغازی بالاتفاق
معروف ہیں۔ ان میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ ان کی تعداد ستائیس ہے
صرف وقت کی تقدیم اور تاخیر میں اختلاف ہے۔

(تاریخ طبری جلد اول، نفیس اکیڈمی کراچی صفحہ ۳۸۳)

ان چھبیس یا ستائیس غزوات میں سے صرف آٹھ میں حضرت عمر
کا تذکرہ ہے۔ حالانکہ حضرت عمرؓ چار یارانِ رسول میں سے ہیں۔ اور آپ کو
رسول اللہ کا انتہائی قریب ساتھی اور جانثار سمجھا جاتا ہے۔

طبری کی اسی جلد میں سرایا کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی تعداد میں
اختلاف ہے۔ فاضل مورخ عبداللہ ابن ابی بکر کے حوالہ سے سرایا کی تعداد
پینتس بیان کرتا ہے اور محمد بن عمر کے حوالے سے تعداد اڑتالیس بیان کرتا
ہے۔ ان تمام سرایہ میں سے صرف ایک میں حضرت عمر بحیثیت امیر کے گئے ہیں
یہ سریہ عمر بن الخطاب کے نام سے موسوم ہے اور ایک میں عمرو بن العاص
کی ماتحتی میں شریک ہوئے ہیں۔

اب ہم ان غزوات اور سرایہ کے حوالہ سے حضرت عمرؓ کی خدمات کا
جائزہ لیں گے۔

غزوہ بدر:

یہ پہلا اور اہم ترین غزوہ ہے۔ اس غزوہ میں بڑے بڑے سرداران

قریش قتل ہوئے اور جو زندہ بچے انہیں اسیری کی ذلت اٹھانا پڑی۔ یہ لڑائی رمضان کی ۱۷یا ۱۹ تاریخ کو ۲ھ میں ہوئی۔ کنز العمال کے مطابق رسول اللہ کا علم حضرت علی ابن ابی طالب کے پاس تھا اور انصار کا علم سعد بن عبادہ کے پاس۔ بعض نے تیسرے علمبردار کی حیثیت سے مصعب کا نام بھی لیا ہے۔ مگر کہیں حضرت عمرؓ کا نام نہیں ہے اور نہ کسی اور کارِ نمایاں کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے سیرت ابن ہشام کے حوالہ سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ماموں کو قتل کیا مگر براہ راست اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ باقی تاریخوں میں تو اس واقعہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے۔

سب سے پہلے لشکر کفار کے علمبردار عتبہ نے اپنے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کے ہمراہ میدان میں آ کر مسلمانوں کو للکارا جنہیں حضرت علی اور حضرت حمزہ نے قتل کیا۔ مورخ ابو الفدا کے مطابق مشاہیر کفار میں سے جو لوگ قتل ہوئے ان میں سے حنظلہ بن ابو سفیان اور ابو عبیدہ ابن سعید اور نوفل (شیطان قریش) اور عمیر بن عثمان تیمی اور عبداللہ بن منذر اور عاص بن مبنہ اور ابو العاص بن قیس کو حضرت علیؑ نے قتل کیا اور زمعہ بن اسود کو حضرت حمزہ اور حضرت علی نے ملکر تہ تیغ کیا اور ابو البختری بن ہشام کو مجدر بن زیاد نے مارا اور مسعود بن امیہ کو حضرت حمزہ نے قتل کیا۔ دنبیہ بن حجاج کو حضرت حمزہ اور سعد بن ابی وقاص نے ملکر مارا اور منبہ بن حجاج کو ابو الیسر انصاری نے قتل کیا۔ (تاریخ ابوالفدا ۳۰ ذکر غزوہ بدر الکبریٰ جلد اول مطبوعہ بیروت)

دراصل جنگ بدر میں فتح کا سہرا علی اور حمزہ کے سر ہے۔ بقول پروفیسر

ڈی ایس مارگولیتھ :

It certainly appears that winning of this most important fight was in the main due to the powers of ALI (Fought without armour) and Hamza.

(Life of Mohammad P.260)

مولانا شبلی نعمانی الفاروق میں تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت عمرؓ اگرچہ اس معرکہ میں رائے و تدبیر، جانبازی و پامردی کے لحاظ سے ہر موقع پر رسول اللہ کے دست بازو رہے۔" مگر مولانا موصوف ان چاروں باتوں میں سے کسی ایک کی کوئی مثال پیش نہیں کر سکے۔ اور ان کے لئے یہ ممکن بھی نہ تھا۔ کیونکہ کسی تاریخ میں حضرت عمرؓ کی کسی نمایاں سرگرمی کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ جانبازی کے نمایاں مظاہرے کرنے والوں کے نام تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ ہم نے اس سلسلہ میں اختصار کے ساتھ صحیح صورت حال پیش کر دی ہے اب ہم اس رائے اور تدبیر کا بھی جائزہ لیں گے کہ جس کا ذکر شبلی صاحب نے کیا ہے کیونکہ صحیح رائے اور مناسب تدبیر بھی ایک بڑی خدمت ہے۔ طبری لکھتا ہے کہ "آپ کو اطلاع ملی کہ قریش اپنے قافلہ کی مدافعت کے لئے آرہے ہیں۔ آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ سب سے پہلے ابوبکر نے کھڑے ہو کر حمایت اور جانثاری کا وعدہ کیا، پھر عمر بن الخطاب نے اسی قسم کی تقریر کی۔ اس کے بعد مقداد بن عمرو کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا رسول اللہ صلعم جو حکم اللہ نے آپ کو دیا ہے اس پر عمل کریں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم آپ سے نہیں کہتے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا رب جاؤ اور لڑو اور ہم تو یہاں بیٹھتے ہیں۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ ہم اور آپ کا رب ساتھ چلیں اور ہم آپ دونوں کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ قسم ہے اس ذات کی جس

نے واقعی آپ کو نبی مبعوث فرمایا ہے۔ اگر آپ ہمیں برک الغماد یعنی حبشہ کے بڑے شہر کی طرف لے چلیں تو جتنی مزاحمتیں راہ میں پیش آئیں گی۔ ہم ان کو ہٹا دیں گے۔ یہاں تک کہ آپ اس مقام تک پہنچ جائیں۔ رسول اللہ صلعم نے ان خیالات پر ان کی تعریف کی اور ان کے لئے دعائے خیر کی۔

عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے مقداد کا ایسا واقعہ دیکھا کہ اگر وہ میرے ساتھ گزرتا تو میں اسے تمام دنیا کی چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ محبوب و عزیز رکھتا۔ یہ بڑے جری آدمی تھے۔ رسول اللہ صلعم کی یہ کیفیت تھی کہ جب آپ کو غصہ آتا تو دونوں رخسار سرخ ہو جاتے۔ مقداد ایسے ہی موقع پر حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ رسول اللہ صلعم آپ کو بشارت ہو۔ بخدا ہم آپ کو وہ جواب نہیں دیتے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ کو دیا تھا۔ کہ تم اور تمہارا رب جاؤ اور دونوں لڑو۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ بلکہ قسم ہے اس ذات کی کہ جس نے برحق آپ کو نبی مبعوث فرمایا۔ ہم آپ کے آگے پیچھے داہنے اور بائیں اپنی جانیں لڑا دیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ آپ کو فتح عطا فرمائے۔

جب رسول اللہ صلعم نے یہ ارشاد فرمایا۔ سعد بن معاذ نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ جناب والا کا منشا ہماری رائے کا علم ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں انہوں نے کہا ہم آپ پر ایمان لائے۔ ہم نے آپ کی تصدیق کی اور ہم نے آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے آپ سے پختہ عہد و پیمان کئے اس لئے اب جو آپ کا ارادہ ہو۔ اس پر عمل فرمایئے، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق مبعوث فرمایا ہے۔ اگر آپ ہمیں لیکر اس سمندر کے سامنے جائیں گے اور اس میں گھس پڑیں گے۔ ہم بھی آپ کے ساتھ اس میں گھس پڑیں گے اور ہمارا ایک شخص بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم اس سے ہرگز

نہیں گھبراتے کہ کل آپ ہمارا ہمارے دشمن سے مقابلہ کرائیں. ہم لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں اور مقابلہ میں پوری طرح داد مردانگی دیتے ہیں شاید اللہ ہماری وجہ سے آپ کو ایسی مسرت عطا کردے. جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں. اللہ کا نام لے کر آپ ہمیں لے کر بڑھیں.

"سعدؓ کے اس قول سے رسول اللہ صلعم خوش ہوئے اور آپ کا حوصلہ بڑھ گیا."

(تاریخ طبری، جلد اول، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۶۹ - ۱۷۰)

مورخ ابن اثیر الکامل میں لکھتا ہے.

"پھر آپ نے اپنے صحابہ سے مشورہ طلب فرمایا، حضرت ابوبکر نے اچھا ہی اچھا کہا، حضرت عمر نے بھی اچھا ہی اچھا کہا، مقداد بن عمرو کھڑے ہوئے اور عرض کیا........"

(اردو ترجمہ، الکامل ابن اثیر، جلد ۲، ناشر دائرہ معین المعارف کراچی صہ ۱۸۸)

جناب مقداد کی وہی گفتگو ابن اثیر نے بھی لکھی ہے کہ جو طبری نے لکھی. پھر آگے چل کر سعد بن معاذ کی گفتگو بھی طبری کے مطابق ہے. لہذا ہم نے تکرار سے بچنے کے لئے اسے چھوڑ دیا. اصل بات ہمیں یہ دکھانا تھی کہ ابن اثیر کے مطابق حضرت عمر نے کس جذبہ کا اظہار کیا اور یہ جبری میں بیان کردہ انداز سے بھی گیا گزرا ہے. یہاں تو اچھا ہی اچھا کہہ کر ٹال دیا گیا.

امام احمد ابن حنبل فرماتے ہیں.

عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاور الناس یوم بدر فتکلم ابوبکر فاعرض عنہ ثم تکلم عمر فاعرض عنہ، یعنی انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن لوگوں سے

مشورہ کیا تو ابوبکر بولے۔ مگر آنحضرت نے ان سے منہ پھیر لیا۔ پھر حضرت عمرؓ بولے تو آنحضرت نے ان سے بھی منہ پھیر لیا۔

(مسند احمد ابن حنبل جلد ۳، مطبوعہ مصر سنہ اشاعت ۱۳۱۳ھ ص ۲۱۹)

فقال عمر بن الخطاب یا رسول اللہ انہا قریش وعزھا واللہ ما ذلت منذ عزت ولا آمنت منذ کفرت واللہ لتقاتلنک فتاھب لذلک أھبتہ واعدد لہ عدتہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أشیروا علی۔

(تفسیر درمنثور جلد ۳ مطبوعہ دہلی صہ ۱۶۶)

ترجمہ: پھر حضرت عمر نے کہا یا رسول اللہ یہ قریش اور انکی طاقت کا مقابلہ ہے۔ خدا کی قسم جب سے وہ لوگ صاحب عزت ہوئے کبھی کسی سے نہیں دبے اور جب سے کافر ہوئے ایمان نہیں لائے اس وجہ سے آپ ان کے مقابلہ کا پورا سامان کر کے تشریف لے چلیں۔ پھر رسول اللہ نے فرمایا اور کوئی مجھے مشورہ دے۔"

اس کتاب میں بھی حضرت عمر کے مشورہ کے بعد مقداد کی پرجوش حمایت کا تذکرہ ہے جیسا کہ طبری میں ہے۔

ہم نے جنگ بدر کے سلسلے میں مشوروں کا تذکرہ تاریخ طبری، تاریخ کامل، مسند احمد ابن حنبل اور تفسیر درمنثور سیوطی سے پیش کیا ہر ایک میں مقداد اور سعد بن معاذ کی پرجوش حمایت کا تذکرہ ہے۔ دونوں حضرات رسول اللہ کے حکم پر آنکھ بند کر کے ہر خطرہ مول لینے کو تیار نظر آتے ہیں۔ (جیسا کہ ان کی تقریر کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے) مگر حضرت عمرؓ کے بارے میں طبری مبہم الفاظ لکھتا ہے۔ ابن اثیر کہتا ہے کہ رسول اللہ کے مشورہ پر حضرت عمر نے اچھا ہی اچھا کہا۔ مسند احمد ابن حنبل میں ہے کہ

رسول اللہ نے حضرت عمر کے مشورہ پر منہ پھیر لیا اور تفسیر درمنثور میں ہے کہ حضرت عمر نے قریش کی طاقت اور ان کے کفر کی حالت بیان کر کے پوری تیاری کے ساتھ جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ رسول اللہ نے ان کے مشورہ کو نظر انداز کر کے اور دوسروں سے مشورہ طلب کیا تو مقداد کھڑے ہوئے اور آنحضرت نے ان کی پرجوش حمایت اور بھرپور اطاعت پر خوشی کا اظہار کیا۔

حضرت عمرؓ کو جو درجہ دیا جانے لگا ہے اس کے مطابق تو آپ کو وہی کچھ کہنا چاہیے تھا کہ جو جناب مقداد نے کہا۔ مگر آپ نے جو کچھ کہا اس پر تو رسول اللہ کو سخت غصہ آیا اور یہ غصہ ابن مسعود کی اس روایت سے ثابت ہے کہ جسے ہم پچھلے صفحات میں تحریر کر چکے ہیں۔ جس کے مطابق مقداد نے ایسے موقعہ پر حاضر ہو کر اظہارِ جذبات فرمایا کہ جب رسول اللہ کا چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ اور آنحضرت کا یہ غصہ حضرت عمرؓ کے مشورہ کی بنا پر تھا۔ کیونکہ تمام روایات کے مطابق جناب مقداد نے عمرؓ کے مشورے کے بعد ہی اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔

غزوہ احد

یہ جنگ شوال ۳ھ میں واقع ہوئی۔ غیض و غضب سے مغلوب تین ہزار کا لشکرِ کفار، ابوسفیان کی سرکردگی میں بدر کی ذلت آمیز شکست کا بدلہ لینے احد کے دامن میں پہنچا۔ ادھر رسول اللہ صلعم سات سو افراد کے ساتھ اس کے مدمقابل ہوئے۔ کفار کے لشکر کا نشان بردار طلحہ بن عثمان تھا اور رسول کی فوج کا علم مصعب بن عمیر کے پاس تھا۔ اور ان کی شہادت کے بعد یہ علم رسول اللہ نے حضرت علی ابن ابی طالب کو عطا کیا۔ (طبری) رایت یعنی لشکر

اسلام کا بڑا علم حضرت علی کو عطا کیا گیا۔ (تاریخ خمیس) کہیں کوئی روایت ایسی نہیں ملتی کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت عمرؓ کو بھی کوئی نشان عطا ہوا۔

اب ہم میدانِ جنگ میں صحابہ کرام کی خدمات کا جائزہ لیں گے تاکہ حضرت عمرؓ کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔

مورخ طبری سدی سے روایت کرتا ہے۔

"طلحہ بن عثمان مشرکوں کے علمبردار نے میدان میں نکل کر کہا اے محمدؐ کے ساتھیوں تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ ہم کو تمہاری تلواروں کے ذریعہ بہت جلد دوزخ میں لے جائے گا اور تم کو ہماری تلواروں کے ذریعہ فوراً جنت میں داخل کر دے گا۔ لہٰذا کوئی مردِ میداں ہے جسے اللہ میری تلوار سے فوراً جنت میں لے جائے یا اس کی تلوار سے مجھے دوزخ دکھائے علیؑ ابن طالب کھڑے ہوئے اور کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں اس وقت تک تجھ کو نہ چھوڑوں گا۔ جب تک کہ اپنی تلوار سے تجھے جہنم واصل نہ کردوں یا تیری تلوار سے جنت میں نہ جاؤں۔ علیؑ نے تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا پاؤں قطع کر دیا۔ وہ اس طرح گرا کہ اس کی شرم گاہ کھل گئی۔ کہنے لگا کہ اے میرے بھائی میں تم کو اللہ اور اپنی قرابت کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھے نہ مارو۔ علی نے اسے چھوڑ دیا، رسول اللہ نے تکبیر کہی، صحابہ نے حضرت علی سے پوچھا کہ تم نے کیوں اس کا کام تمام نہ کر دیا۔ کہنے لگے کہ میرے چچیرے بھائی کی جب شرم گاہ عریاں ہو گئی۔ اس نے مجھے اللہ اور قرابت کا واسطہ دیا مجھے شرم آگئی۔ پھر زبیر بن عوام اور مقداد بن الاسود نے مشرکوں پر حملہ کیا اور ان کو مار بھگایا۔ رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہ نے حملہ کیا اور ابو سفیان کو بھگا دیا۔

(تاریخ طبری، حصّہ اول ..... صفحہ ۲۳۰)

مورخ ابن اثیر لکھتا ہے۔

"حمزہ، علی اور ابو دجانہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کافروں کی جماعتوں کے اندر گھس گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد مسلمانوں پر بھیجدی تھی اور کفار کو شکست ہوچکی تھی۔"

(اردو ترجمہ تاریخ کامل جلد ۲، دائرہ معین المعارف کراچی صد ۲۴)

مولانا شبلی نعمانی بھی مندرجہ بالا عبارت کی تائید کرتے ہیں۔

"۷ شوال ہفتہ کے دن لڑائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے زبیر نے اپنی رکاب کی فوج لے کر حملہ کیا۔ اور قریش کے میمنہ کو شکست دی پھر جنگ شروع ہوئی۔ حضرت حمزہ حضرت علی، ابو دجانہ فوج میں گھس گئے اور ان کی صفیں الٹ دیں۔ لیکن فتح کے بعد لوگ غنیمت پر لوٹ پڑے۔۔۔۔"

(الفاروق

لاہور صد ۴۹)

مورخ طبری حضرت حمزہ کی شجاعت کے عنوان سے لکھتا ہے۔

مصعب کی شہادت کے بعد آپ نے اپنا علم علی بن ابی طالب کو دیدیا۔ حمزہ بن عبدالمطلب دشمن سے لڑے۔ انہوں نے الطاۃ بن عبد شرجبیں بن ہاشم بن عبدمناف بن عبدالدار بن قصی کو اس روز جو قریش کے علمبرداروں میں تھا قتل کر دیا۔ پھر ابو نیار سباع بن عبدالعزیٰ الغیشانی ان کے پاس سے گزرا۔ حمزہ بن عبدالمطلب نے اس سے کہا اے عورتوں کے ختنہ کرنے والی کے بیٹے میری طرف آؤ۔ اس کی ماں ام انمار شریق بن عمرو بن وہب الثقفی کی باندی تھی اور مکہ میں یہ ختنہ کیا کرتی تھی۔ دونوں کا مقابلہ ہوا حمزہ نے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔

جبیر بن مطعم کا غلام وحشی کہتا ہے کہ اب تک حمزہ کی صورت میری

نظروں میں ہے ان کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنی تلوار سے لوگوں کے پرزے پرزے کر رہے تھے اور خاکی رنگ کے نر اونٹ کی طرح جو چیز سامنے آتی اسے وہ گرا دیتے۔" (تاریخ طبری، حصہ اول صفحہ ۲۳۶

طبری حضرت علیؓ کی شجاعت کے عنوان سے لکھتا ہے۔

"ابو رافع سے مروی ہے کہ جب علی ابن ابی طالب نے مشرکین کے علمبرداروں کو تہ تیغ کر دیا۔ رسول اللہ کی نظر مشرکوں کی ایک اور جماعت پر پڑی آپ نے علی سے کہا اس پر حملہ کرو۔ انہوں نے حملہ کر کے اس جماعت کو منتشر کر دیا اور بنی عامر بن لوی کے شیبہ بن مالک کو قتل کر دیا۔ حضرت جبرئیل نے رسول اللہ صلعم سے کہا کہ یہ ہے ہمدردی۔ آپ نے فرمایا بیشک علی مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ جبرئیل نے کہا اور میں آپ دونوں کا تیسرا ہوں۔ نیز صحابہ نے یہ آواز بھی سنی۔ لاسیف الا ذوالفقار۔ ولا فتیٰ الا علی۔" (تلوار صرف ذوالفقار اور جواں مرد صرف علی ہیں۔)

(تاریخ طبری حصہ اول، نفیس اکیڈمی صہ ۲۳۴، اردو ترجمہ تاریخ کامل جلد ۲ ابن اثیر ص ۲۴۶)

مورخین نے حمزہؓ، علیؓ، زبیرؓ اور ابو دجانہ کے علاوہ سعد بن ابی وقاص اور بعض انصار کی جوانمردی اور جانثاری کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر حضرت عمر کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ آپ کس طرح سے لڑے۔ رسول اللہ کو دشمنوں سے بچانے کے لئے کیا کیا۔ کس کو قتل کیا کسے زخمی کیا۔ خود بھی کوئی زخم کھایا یا نہیں۔ اگر کہیں ذکر آیا ہے تو اس طرح سے کہ حیرت ہوتی ہے مورخین لکھتے ہیں۔

قاسم بن عبدالرحمٰن بن رافع سے مروی ہے کہ انس بن مالک کے چچا انس بن النضر عمر بن الخطاب اور طلحہ بن عبیداللہ کے پاس آئے جو چند

مہاجرین کے ساتھ ہاتھ چھوڑے بیٹھے تھے۔ انس نے کہا کیوں اس طرح بیٹھے ہو۔ انہوں نے کہا محمد رسول اللہ مارے گئے۔ انس نے کہا پھر ان کے بعد زندہ رہ کر کیا کرو گے، اٹھو اور اس دین پر جس پر خود رسول اللہ صلعم کا وصال ہوا اپنی جانیں دے دو۔ یہ کہہ کر خود وہ تو دشمن کے سامنے آئے لڑے اور مارے گئے۔ انہیں کے نام پر انس بن مالک کا نام انس رکھا گیا۔ انس بن مالک سے مروی ہے کہ اس روز انس بن النضر پر ہم نے تلوار اور نیزے کے ستر زخم پائے۔ صرف ان کی بہن ان کی خوبصورت انگلیوں کی وجہ سے انکو شناخت کر سکیں۔"

(تاریخ طبری، حصہ اول، نفیس اکیڈمی کراچی صہ ۲۳۷، اردو ترجمہ تاریخ کامل جلد ۲، ناشر دائرہ معین المعارف صہ ۲۵۱)

مولانا شبلی نعمانی نے بھی حضرت عمر کی اس حالت کا اعتراف کیا ہے آپ "الفاروق" میں لکھتے ہیں۔

"تمام روایتوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت کی شہادت کی خبر معلوم ہوئی تو کچھ لوگ ایسے سراسیمہ ہوئے کہ انہوں نے مدینہ سے ادھر دم نہیں لیا۔ کچھ لوگ جان پر کھیل کر لڑتے رہے کہ رسول اللہ صلعم کے بعد جینا بے کار ہے۔ بعضوں نے مایوس ہو کر سپر ڈالدی کہ اب لڑنے سے کیا فائدہ ہے۔ حضرت عمر اس تیسرے گروہ میں تھے۔"
(الفاروق)

بعض روایتیں ایسی ہیں کہ جن میں حضرت عمر کو راہ فرار اختیار کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ تفسیر در منثور میں ہے کہ:

"حضرت عمر نے جمعہ کو خطبہ میں سورہ آل عمران پڑھی جب آیت ان الذین تولوا منکم (تم میں سے جو لوگ بھاگ گئے) پر پہنچے تو کہنے لگے کہ جب غزوہ احد میں ہم نے ہزیمت اٹھائی تو میں نے راہ فرار اختیار کی یہاں تک کہ

پہاڑ پر چڑھ گیا۔ وہاں میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ اس طرح کودتا پھرتا ہوں گویا میں پہاڑی بکری ہوں۔"

(تفسیر در منثور جلد ۲ ص ۸۸، مطبع میمنیہ مصر اشاعت ۱۳۱۴ھ۔ تفسیر طبری جلد ۴ ص ۹۰)

جب مسلمان شکست کھا جانے کے بعد پہاڑ پر رسول اللہ صلعم کے ساتھ اکٹھا ہوئے تو اس وقت کی دو روایتیں ایسی ملتی ہیں کہ جن میں حضرت عمر کے حصہ لینے کا کچھ حال لکھا ہے۔ پہلی روایت کے مطابق۔ جب ابوسفیان بھی پہاڑ پر چڑھ آیا تو اس نے کہا۔

عزّا ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی عزّا نہیں ہے۔ رسول اللہ صلعم نے عمر سے کہا۔ کہو اللہ ہمارا مولےٰ ہے اور تمہارا کوئی مولےٰ نہیں۔ اور دوسری روایت کے مطابق:

"سلمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم چند صحابہ کے ہمراہ درے میں بیٹھے تھے۔ قریش کی ایک جماعت پہاڑ پر چڑھ آئی۔ آپ نے فرمایا۔ خداوند ایسا نہ ہونے پائے کہ وہ پہاڑ پر چڑھ آئیں۔ عمر بن خطاب نے مہاجرین کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ ان حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور ان کو پہاڑ سے نیچے اتار دیا۔ (تاریخ طبری، حصہ اوّل ص ۲۴۰)

مگر ساتھ ہی ساتھ طبری نے ایک اور عبارت بھی لکھی ہے ملاحظہ ہو۔

"ابوسفیان اس جماعت کی طرف آیا۔ جب وہ پہاڑ پر چڑھ آیا اور صحابہ نے اسے دیکھا وہ اپنی خوشی کو بھول گئے اور اس کی پیش قدمی سے متاثر ہوگئے۔

رسول اللہ صلعم فرمانے لگے وہ ہم پر کبھی غلبہ نہ پائیں گے اے اللہ اگر یہ میری جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر کوئی تیرا پرستار نہ رہے گا۔ پھر آپ نے

صحابہ کو مدافعت کا حکم دیا۔ انہوں نے دشمن پر پتھر پھینکے اور ان کو پہاڑ سے نیچے گرا دیا۔" (طبری جلد ا ص ۲۴۰)

مورخین خاموش ہیں، کوئی یہ نہیں بتاتا کہ دوران جنگ کسی وقت رسول اللہ صلعم نے عمرؓ سے کچھ کہا ہو یا آپ نے کوئی کارنمایاں انجام دیا ہو۔ مگر جنگ ختم ہو گئی اور رسول اللہ صلعم اپنے اصحاب کے ساتھ پہاڑ پر ہیں تو ابو سفیان کی اس بات کے جواب میں کہ ہمارا عزیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزیٰ نہیں۔ آنحضرت عمرؓ سے کہتے ہیں کہ تم اسکے جواب میں کہو کہ ہمارا مولےٰ اللہ ہے اور تمہارا کوئی مولےٰ نہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ رسول اللہ صلعم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہ جواب دیتے ہیں بعد کے مسلمانوں میں اس جواب کو حضرت عمر کے لئے بہت بڑا اعزاز سمجھا جانے لگا۔ خاص طور سے شاہ ولی اللہ ازالۃ الخفاء میں اس بات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں کہ اس کام کے لئے رسول اللہ صلعم نے حضرت عمر کو منتخب کیا۔ حالانکہ اس میں نہ کوئی اعزاز کی بات ہے اور نہ کسی اہمیت کی۔ یہ جواب دینے میں نہ تو حضرت عمر کو کچھ محنت کرنا پڑی اور نہ ہی آپ کی جان خطرہ میں پڑی۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ اس کام کے لئے رسول اللہ صلعم کی نظر انتخاب حضرت عمر ہی پر کیوں پڑی اور پھر یہ پہلو نکالے کہ آنحضرت کی نظر میں ابوبکرؓ کے بعد یہی صاحب سب سے زیادہ تھے۔ (جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے) تو یقیناً یہ بڑی ہلکی بات ہو گی۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم سے قربت کی کسوٹی تو وہ موقعہ تھا کہ جب میدانِ کارزار گرم تھا، سر تن سے جدا ہو رہے تھے اور رسول کے جاں نثار اپنی جانیں خطرہ میں ڈال رہے تھے۔ (جسے ہم تفصیل سے پیش کر چکے ہیں۔) بات دراصل یہ ہے کہ جناب شاہ ولی اللہ اپنے ممدوح کی حمایت باطلہ میں اس بات سے صرف نظر کر گئے کہ حضرت عمرؓ سے تو ہمیشہ اس قسم کے کام لئے جاتے تھے۔ ایام جاہلیت میں بھی آپ ہی کو

مفاخرۃ، اور منافرۃ کے لئے مخالف کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ اب رہ گیا جنگ احد کا دوسرا اعزاز (بقول شاہ ولی اللہ) کہ حضرت عمرؓ نے مہاجرین کی ایک مختصر سی جماعت لیکر ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں کو اس وقت مار بھگایا کہ جب وہ لوگ پہاڑ پر چڑھ آئے تھے تو اس میں بھی کوئی اہمیت نہیں، اول تو یہ کہ طبری نے ایک روایت بیان کی ہے کہ صحابہ نے پتھراؤ کر کے انہیں نیچے گرا دیا تھا۔ اس روایت میں کسی کا نام نہیں، صرف صحابہ، کہا گیا ہے۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے مقابلے کی بات مشکوک ہو جاتی ہے۔ پھر اگر حضرت عمرؓ نے مقابلہ کیا بھی تو اس میں حضرت عمر کی شجاعت یا رسول اللہ صلعم کے لئے جذبہ جانثاری کا کچھ دخل نہ تھا۔

"شجاعت اور جانثاری کا موقع تو کچھ دیر پہلے گذر چکا تھا۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو سفیان تو محض چند ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑ پر یہ معلوم کرتے آیا تھا کہ رسول اللہ صلعم زندہ ہیں یا نہیں۔ لہٰذا ایسے چند آدمیوں کو کہ جو باقاعدہ حملہ کی نیت سے نہ آئے ہوں۔ مار بھگانا کون سا بڑا کارنامہ ہے"

غزوہ خندق

بنو نضیر مدینہ سے جلا وطن ہوئے تو خیبر میں جا بسے۔ وہاں پہنچ کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ مکہ میں اپنے نمائندے بھیج کر قریش کو ورغلایا۔ آہستہ آہستہ تمام قبائل عرب کو مسلمانوں کے خلاف اکٹھا کر لیا اور شوال ۵ھ میں دس ہزار کا یہ لشکر مدینہ پر چڑھ آیا۔ جناب رسول خدا نے اس یلغار کو روکنے کے لئے حضرت سلمان فارسی کے مشورے سے خندق تیار کروائی۔ کفار نے مسلمانوں کا محاصرہ کر لیا اور

مد بند کر دی۔ مگر کسی بڑی جنگ کی نوبت نہ آئی۔

اس جنگ میں بس اہم مقابلہ عمرو بن عبدود اور حضرت علی ابن ابی طالب کا تھا۔ عمرو بڑا نامی گرامی پہلوان تھا اور اکیلا سینکڑوں پر بھاری۔

مورخ طبری لکھتا ہے :-

"رسول اللہ صلعم اسی طرح خندق میں مقیم رہے۔ دشمن نے ان کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ البتہ قریش کے چند دلاور شہسوار جن میں بنی عامر بن لوی کا عمرو بن عبدود بن ابی قیس، عکرمہ بن ابی جہل المخزومی، ہبیرہ بن ابی وہب المخزومی، نوفل بن عبداللہ اور بنی محارب بن فہر کا ضرار بن الخطاب بن مرداس تھے۔ ...... انہوں نے خندق کا ایک تنگ مقام دیکھ کر اپنے گھوڑے اس پر سے کدا دیئے اور خندق کے ادھر سنجر میں خندق اور سلع کے درمیان جولانی کرنے لگے۔ علی بن ابی طالب چند مسلمانوں کے ساتھ مقابلے کے لئے نکلے .... علی نے اس سے کہا اے عمرو تم ہمیشہ اللہ کے سامنے یہ کہا کرتے تھے کہ قریش کا کوئی شخص میرے سامنے دو باتیں پیش کرے گا، میں ان میں سے ایک ضرور مانوں گا۔ اس نے کہا ہاں میرا یہی عہد ہے۔ علی بن ابی طالب نے اس سے کہا اچھا اب میں تم کو اللہ عزوجل اس کے رسول اور اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اس نے کہا میں نہیں مانتا۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ علی نے کہا اچھا تو پھر میں تم سے کہتا ہوں کہ گھوڑے سے نیچے سے آؤ۔ اس نے کہا کہ اے میرے بھتیجے یہ کیوں۔ بخدا میں نہیں چاہتا کہ تم کو قتل کر دوں۔ علی نے کہا مگر بخدا میں تو چاہتا ہوں کہ تم کو ضرور قتل کروں۔ اس جملہ کو سن کر اسے جوش آگیا۔ وہ اپنے گھوڑے سے کود پڑا۔ پھر اس نے اس کو ذبح کر دیا۔ یا اس کے منہ پر تلوار ماری اور اب علی کے مقابلے پر بڑھا۔ ایک نے دوسرے

پر پینترے بدل بدل کر وار کئے۔ آخر کار علی نے اسے قتل کر دیا۔"

(تاریخ طبری، حصہ اول، ص ۲۸۵

مولانا شبلی نعمانی سیرت النبی میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ان میں سے سب سے زیادہ مشہور بہادر عمرو بن عبدود تھا۔ وہ ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا۔ سب سے پہلے وہی آگے بڑھا اور عرب کے دستور کے مطابق پکارا کہ مقابل کو کون آتا ہے؟ حضرت علی نے اُٹھ کر کہا کہ میں۔ لیکن آنحضرت نے روکا کہ یہ عمرو بن عبدود ہے۔ حضرت علی بیٹھ گئے۔ لیکن عمرو کی آواز کا اور کسی طرف سے جواب نہیں آتا تھا۔ عمرو دوبارہ پکارا اور پھر وہی ایک صدا جواب میں تھی۔ تیسری دفعہ جب آنحضرت نے فرمایا کہ عمرو ہے تو حضرت علی نے عرض کی ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو ہے غرض آپ نے اجازت دے دی۔ خود دست مبارک سے تلوار عنایت کی سر پر عمامہ باندھا.......... حضرت علی نے کہا مجھ سے معرکہ آرا ہو عمرو ہنسا اور کہا مجھ کو امید نہ تھی کہ آسمان کے نیچے یہ درخواست بھی میرے سامنے پیش کی جائے گی۔ حضرت علی پیادہ تھے۔ عمرو کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا۔ گھوڑے سے اتر آیا اور پہلی تلوار گھوڑے کے پاؤں پر ماری کہ کوچیں کٹ گئیں۔ پھر پوچھا کہ تم کون ہو؟ آپ نے نام بتایا۔ اس نے کہا میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ آپ نے فرمایا ہاں لیکن میں چاہتا ہوں عمرو اب غصہ سے بے تاب تھا۔ پرتلے سے تلوار نکالی اور آگے بڑھ کر وار کیا۔ حضرت علی نے سپر پر روکا۔ لیکن تلوار سپر میں ڈوب کر نکل آئی اور پیشانی پر لگی.......... دشمن کا وار ہو چکا تو حضرت علی نے وار کیا ان کی تلوار شانہ کاٹ کر نیچے اتر آئی۔ ساتھ ہی حضرت علی نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور فتح کا اعلان ہو گیا۔

از علی مرتضٰے دریں غزوہ (خندق) مبارزہا و مقاتلہا واقع شدہ از حد قیاس وعقل بیرون۔ چنانکہ در اخبار وارد شدہ است لمبارزۃ علی ابن ابی طالب یوم الخندق افضل من اعمال امتی الی یوم القیامۃ۔ وآنحضرت دعاہا کرد در حق علی مرتضیٰ وشمشیر خود راکہ ذوالفقار نام داشت لوے عطا نمود۔ یعنی غزوہ (خندق) میں حضرت علی سے شجاعت و بہادری کے وہ کارنامے ظاہر ہوئے کہ جو حد قیاس وعقل سے باہر ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ علی ابن ابی طالب کی خندق کے دن جنگ میری امت کے قیامت تک کے ہونے والے اعمال سے افضل ہے۔ اور آنحضرت نے علی مرتضیٰ کے حق میں دعا کی اور اپنی تلوار کہ جس کا نام ذوالفقار تھا عطا کی۔

(مدارج النبوہ جلد ۲، از شاہ عبدالحق محدث دہلوی، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۷۱)

اب حضرت عمر کی مردانگی ملاحظہ فرمائیے

"عمرو کے بعد ضرار اور ہبیرہ نے حملہ کیا۔ لیکن جب ذوالفقار کا ہاتھ بڑھا تو پیچھے ہٹنا پڑا۔ حضرت فاروق نے ضرار کا تعقب کیا۔ ضرار نے مڑکر برچھے کا وار کرنا چاہا۔ لیکن روک لیا اور کہا عمر اس احسان کو یاد رکھنا۔"

(سیرت النبی جلد اول، ناشران قرآن لاہور صد ۴۳۶ - ۴۳۷)

یہی روایت تاریخ خمیس کے مطابق:

"(عمرو بن عبدود کے قتل کے بعد) زبیر بن عوام اور حضرت عمرؓ بن خطاب نے عمرو بن عبدود کے باقی ساتھیوں پر حملہ کرنا چاہا۔ ان

لوگوں میں ضرار بن خطاب بھی تھا جو بھاگا جاتا تھا اور حضرت عمر اس کے پیچھے دوڑے جا رہے تھے۔ آگے بڑھ کر اس نے پلٹ کر دیکھا کہ کوئی تعقب کر رہا ہے (جب دیکھا کہ عمر ہیں تو مطمین ہو کر) پلٹا حضرت عمر پر نیزہ لے کر بڑھا کہ وار کر ہی دے۔ پھر (کچھ سوچ کر) روک لیا اور کہا لو عمر جاؤ تم پر میرا وہ احسان ہے جس کا بدلہ تم کبھی نہیں چکا سکتے۔ خیر مگر اس کو یاد رکھنا۔"

(تاریخ خمیس جلد اول ۴۸ ۵، مطبوعہ مصر ۱۳۰۲ھ پہلا ایڈیشن)

حضرت عمر کے بارے میں ایک روایت ازالۃ الخفاء، شاہ ولی اللہ میں بھی ہے کہ ایک دن کافروں نے ارادہ کیا تو حضرت عمر نے آگے بڑھ کر روکا۔ ان کی جماعت درہم برہم کر دی۔ اس روایت کو مولانا شبلی نعمانی نے الفاروق میں تحریر تو کیا ہے۔ مگر حاشیہ پر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ میں نے کسی کتاب میں اس کی سند نہیں پائی۔" (الفاروق، مولانا شبلی نعمانی ناشر حافظ محمد الدین اینڈ سنز لاہور ص ۵۵)

طبری نے حضرت عمرؓ کا اس جنگ میں موجود ہونا ظاہر کیا ہے۔ مگر دشمن کے مدمقابل نہیں، بلکہ ایک باغ میں۔

"حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ سعد سب سے زیادہ زبردست اور دراز قامت تھے۔ ان کے جسم پر اس چھوٹی سی زرہ کو دیکھ کر مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کے اطراف تیر نہ لگ جائے۔ وہ رجز پڑھتے ہوئے میرے پاس آئے ع۔ جب وہ مجھ سے آگے چلے گئے۔ میں ایک باغ میں گھس گئی۔ جہاں چند مسلمان بیٹھے تھے۔ ان میں عمر بن الخطاب بھی تھے اور ان میں ایک اور ایسا شخص تھا جس نے کامل خود پہن رکھا تھا کہ اس میں سے صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ عمرؓ نے مجھ سے کہا تم بڑی دلیر ہو۔ یہاں کیوں آئیں۔ ممکن

ہے کہ بھاگنا پڑے یا کسی اور مصیبت میں نہ پڑ جائے۔ اب وہ اس طرح ملامت کرنے میں میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں چاہتی تھی کہ زمین شق ہو جائے اور میں اس میں دھنس جاؤں۔"

(تاریخ طبری، حصہ اول، نفیس اکیڈمی کراچی ص ۲۸۷)

پوری جنگ میں حضرت عمر فاروق دو جگہ نظر آئے ہیں اور کس طرح یہ آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔

مسلمانوں کو اس خوفناک محاصرے سے نجات کا پہلا سبب حضرت علی کے ہاتھوں عمرو بن عبدود کا قتل تھا اور دوسرا سبب نعیم بن مسعود کا جوڑ توڑ جس کی وجہ سے قریش اور یہود میں پھوٹ پڑ گئی۔ پھر شدید سردی اور تیز ہوا کے جھکڑ۔ مولانا شبلی نعمانی جنگ خندق کے خاتمہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

اس لڑائی میں عمرو بن عبدود عرب کا مشہور بہادر جو پانچ سو بہادروں کے برابر سمجھا جاتا تھا حضرت علی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کے مارے جانے کے بعد ادھر تو قریش میں کچھ بے دلی ہوئی۔ اور ادھر نعیم بن مسعود جو اسلام لا چکے تھے اور کافروں کو ان کے اسلام کی مطلق خبر نہ تھی۔ جوڑ توڑ سے قریش اور یہود میں پھوٹ ڈلوادی۔ مختصر یہ کہ قریش کا جو ابر سیاہ مدینہ کے افق پر چھا گیا تھا۔ روز بروز چھٹتا گیا اور چند دن کے بعد مطلع بالکل صاف ہو گیا۔ (الفاروق)

۱۔ طبری کے صفحہ ۲۸۶ پر لکھا ہے کہ "حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس وقت تک ہم پر پردہ فرض نہیں کیا گیا تھا۔

غزوہ حدیبیہ

سنہ ۶ھ میں رسول اللہ صلعم صحابہ کرام کے ہمراہ عمرے کی نیت سے مکہ روانہ ہوئے۔ کفار قریش نے روکنے کی کوشش کی تو آپ نے حدیبیہ میں قیام فرمایا۔ یہاں قریش کی طرف سے عروہ بن مسعود رسول اللہ سے گفتگو کرنے آیا۔ ہم اس کے چند فقرے نقل کرتے ہیں۔ عروہ نے دوران گفتگو کہا کہ :۔

"مجھے جو مختلف صورتیں تمہارے ساتھ نظر آ رہی ہیں۔ ان میں ایسے لوگ ہیں، جن کی فطرت یہ ہے کہ وہ بھاگ جائیں۔ تم کو دشمن کے نرغے میں چھوڑ دیں۔ اس بات کو سن کر ابوبکرؓ نے کہا تو "لات" کی شرمگاہ کو چوس۔ کیا ہم بھاگ جائیں گے اور ان کو چھوڑ دیں گے۔"

(تاریخ طبری، حصہ اول، نفیس اکیڈمی ص ۳۲۹)

عروہ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت رسول اللہ کے اردگرد کچھ ایسے چہرے ضرور تھے کہ جن کے بھگوڑے پن کی فطرت سے وہ پوری طرح واقف تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی نظروں کے سامنے احد کا نقشہ پھر گیا ہو۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر کا بول اٹھنا اور رسول اللہ صلعم کی موجودگی میں ایسی گندی گالی دینا بھی قابل غور بات ہے۔

اس غزوہ میں حضرت عمرؓ کو ایک ایسا حکم دیا گیا کہ جس میں آپ کی جان خطرے میں پڑ سکتی تھی چنانچہ آپ نے صاف انکار کر دیا۔ اس واقعہ کو تمام محققین نے نقل کیا ہے۔ علامہ طبری کے مطابق۔

"آپ نے عمر بن خطاب سے کہا تم مکہ جاؤ اور اشراف مکہ کو میرے آنے کی غرض سے مطلع کرو۔ انہوں نے آپ سے عرض کیا کہ مجھے وہاں جانے

ہیں اپنی جان کا خوف ہے۔ کیونکہ میرے قبیلہ بنی عدی والوں میں سے
کوئی مکہ میں نہیں جو میری حمایت کر سکے۔"

(طبری، حصہ اول، ص ۳۳۴)

جب صلح نامہ حدیبیہ کی شرائط طے پائیں تو آپ بگڑ گئے اور رسول اللہ صلعم کی نبوت میں شک کرنے لگے۔ ہم اس واقعہ کو الفاروق سے نقل کرتے ہیں۔

"معاہدہ ابھی لکھا بھی نہیں جا چکا تھا کہ وہ حضرت ابوبکر کے پاس پہنچے اور کہا کہ اس طرح دب کر کیوں صلح کی جائے۔ انہوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ جو کچھ کرتے ہیں۔ اسی میں مصلحت ہو گی۔ لیکن حضرت عمرؓ کو تسکین نہیں ہوئی۔ خود رسول اللہ کے پاس گئے اور اس طرح گفتگو کی۔

حضرت عمر: یارسول اللہ کیا آپ رسولِ خدا نہیں ہیں۔

رسول اللہ: بے شک ہوں۔

حضرت عمر: کیا ہمارے دشمن مشرک نہیں ہیں۔

رسول اللہ: ضرور ہیں۔

حضرت عمر: پھر ہم اپنے مذہب کو کیوں ذلیل کریں۔

رسول اللہ: میں خدا کا پیغمبر ہوں اور خدا کے حکم کے خلاف نہیں کرتا۔

حضرت عمر کی یہ گفتگو اور خصوصاً اندازِ گفتگو خلاف تہذیب تھا۔ چنانچہ بعد میں ان کو سخت ندامت ہوئی۔"

(الفاروق)

اس غزوہ میں حضرت عمر کی بس یہی خدمات تھیں کہ پہلے تو رسول اللہ صلعم کے حکم پر مکہ جانے سے انکار کر دیا اور جب رسول اللہ نے کفارِ مکہ سے صلح کی شرائط طے کیں تو بگڑ گئے اور رسول اللہ سے گستاخانہ گفتگو

کی اور بعض کے بقول نبوت میں شک کیا۔ ان واقعات کو تقریباً تمام مستند مورخین نے لکھا ہے۔

اب ہم حضرت عمر کے اس اقدام کا تذکرہ کریں گے کہ جس میں اگر آپ کامیاب ہو جاتے تو رسول اللہ صلعم کے کئے دھرے پر پانی پھر جاتا۔ ہوا یوں کہ جب سہیل بن عمرو اپنے مسلمان بیٹے ابو جندل کو صلح نامہ کی رو سے واپس کفار قریش کے پاس زبردستی لے جانے لگے تو حضرت عمر بھی ساتھ ہو لئے۔ طبری کے مطابق :

"حضرت عمر اٹھے اور ابو جندل کے پاس جاکر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور ان سے کہتے تھے تم صبر کرو۔ یہ قریش مشرک ہیں ان کی جان کتے کے برابر ہے۔ اس کے ساتھ وہ اپنی تلوار کا قبضہ اس کے نزدیک کرتے رہے خود عمر کہا کرتے تھے کہ اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ وہ تلوار لے لیں اور اس سے اپنے باپ کا خاتمہ کر دیں۔ مگر انہوں نے اسے گوارا نہیں کیا کہ اپنے باپ کو خود ماریں۔"

تاریخ طبری، حصہ اول، (ص ۳۳۷)

غزوہ حدیبیہ میں حضرت عمرؓ نے کوئی بات بھی ایسی نہیں کی کہ جس سے اسلام کی کوئی خدمت ہوتی یا آپ کی کسی فضیلت کا اظہار ہوتا۔ مگر اسے کیا کہیے کہ حضرت شاہ ولی اللہ ازالۃ الخفاء میں حضرت عمر کی مکہ جانے سے انکار والی بات کو نظر انداز کر گئے اور رسول اللہ سے کئے گستاخانہ مکالموں کو حمیت اسلام کا غلبہ قرار دے کر ایک فضیلت کا اضافہ کیا۔ اور یہ لکھ کر کہ رسول اللہ نے سورہ فتح سب سے پہلے حضرت عمر کو سنائی ایک اور فضیلت گنوائی۔ اس فضیلت کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔

"سوم یہ کہ بوقت مراجعت از حدیبیہ جب مدینہ کے قریب پہنچے

توسورہ فتح نازل ہوئی اور سب سے پہلے آپ نے حضرت عمر فاروق کو بلا کر سنائی۔ یزید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت اپنے بعض سفر میں تھے۔ حضرت عمر فاروق بھی آپ کے ہمرکاب تھے۔ آپ نے آنحضرت کی خدمت میں کسی امر کے متعلق تین دفعہ سوال کیا اور تینوں دفعہ آنحضرت نے آپ کو جواب نہ دیا۔ آپ اپنے دل میں کہنے لگے عمر تیری ماں تجھے گم کرے تو نے تین دفعہ آنحضرت کی خدمت میں سوال کیا اور تینوں دفعہ آپ نے تجھے جواب نہیں دیا۔ حضرت عمر فاروق فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں اپنا اونٹ آگے بڑھا کر آگے چلا گیا اور جی میں ڈرتا رہا کہ میرے بارے میں کہیں وحی نہ نازل ہو۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد بلانے والے نے بلایا اور میں ڈرا کہ میرے بارے میں وحی نازل ہوئی۔ جب آنحضرت کی خدمت میں آیا اور سلام کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت مجھ پر ایک سورۃ نازل کی گئی ہے جو مجھے ہر ایک اس چیز سے جس پر شمس طلوع ہوا مرغوب و پسندیدہ ہے انا فتحنا لك فتحا مبينا ليغفر لك الله ما تقدم من ذ نبك وما تاخر الخ" تلاوت فرمائی۔

(اردو ترجمہ ازالۃ الخفاء، شاہ ولی، ناشر محمد سعید اینڈ سنز کراچی ص ۸۲)

غور فرمایئے کہ اس میں حضرت عمر کی فضیلت کہاں سے آ گئی۔

اس عبارت سے تو صرف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلح نامہ کی شرائط پر حضرت عمر کی برہمی کی وجہ سے ان سے اس درجہ ناراض تھے کہ تین دفعہ سوال کرنے کے باوجود آپ نے کوئی جواب نہیں دیا اور پھر جب سورۃ فتح نازل ہوئی تو سب سے پہلے انہی کو بلا کر سنائی تو اس کا مطلب ان کی فضیلت نہ تھا بلکہ مطلب یہ تھا کہ دیکھو تم میرے فیصلہ کو غلط سمجھ رہے تھے مگر اللہ نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔ جسے تم مسلمانوں کی شکست

قرار دے رہے تھے۔ اسے اللہ نے فتح مبین قرار دیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے ابو جندل والی روایت بھی درج کی ہے مگر اس کا آخری حصہ نظر انداز کر گئے کہ جس میں یہ بات واضح ہے کہ حضرت عمر نے یہ چاہا کہ ابو جندل ان کی تلوار نکال کر اپنے باپ کا کام تمام کر دیں۔ اگر حضرت عمر کی یہ خواہش پوری ہو جاتی تو نئے سرے سے ایک فتنہ پیدا ہو جاتا اور یہ بات یقیناً حضرت عمر کے فضائل میں شمار نہ ہوتی۔

غزوہ خیبر:

۷ھ میں خیبر کی جنگ ہوئی۔ صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ صلعم کو قریش کی طرف سے اطمینان نصیب ہوا تو آپ خیبر کے یہودیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ خیبر میں یہودیوں نے اپنے مضبوط قلعے بنائے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے مسلمانوں کی آمد کا حال سنا تو قلعہ بند ہو گئے۔ اس جنگ میں حضرت عمر کی خدمت اتنی واضح ہے کہ اس سے کسی نے بھی انکار نہیں کیا۔ ابن ہشام سے لیکر شبلی نعمانی تک سب ہی نے تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے ہم چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ طبری کے مطابق:

"بریدہ سے مروی ہے کہ بسا اوقات رسول اللہ صلعم کو درد سر ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ کبھی ایک دن اور کبھی دو دن تک باہر تشریف نہ لاتے تھے۔ چنانچہ خیبر آکر آپ کے سر میں درد ہوا اور آپ برآمد نہ ہوئے۔ ابو بکرؓ نے آپ کے جھنڈے کو لیا۔ حملہ آور ہوئے اور نہایت شدید لڑائی کے بعد پلٹ آئے، پھر عمر نے جھنڈا لیا حملہ کیا اور اس مرتبہ پہلی مرتبہ سے بہت زیادہ شدید لڑائی ہوئی۔ مگر وہ بھی بغیر فتح حاصل کئے پلٹ آئے۔ رسول اللہ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ آپ

نے فرمایا۔ میں کل یہ جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول اسے چاہتے ہیں۔ وہ بزور شمشیر قلعہ فتح کرے گا۔

(تاریخ طبری، حصہ اول (ص ۳۶۰))

طبری کی ایک اور روایت کے مطابق۔

"بریدۃ الاسلمی سے مروی ہے کہ اہلِ خیبر کے قلعہ کے مقابل ہو کر رسول اللہ نے اپنا علم عمر بن الخطاب کو دیا۔ کچھ لوگ ان کے ساتھ ہو کر قلعہ پر حملہ آور ہوئے۔ اہلِ خیبر نے ان کا مقابلہ کیا۔ عمر اور ان کے ہمراہی پسپا ہو کر رسول اللہ صلعم کے پاس پلٹ آئے۔ عمر کے ہمراہی ان کو اور عمر ان کو بزدل ٹھہرانے لگے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ میں کل ایسے شخص کو علم دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہے۔ دوسرے دن ابوبکرؓ اور عمرؓ نے جھنڈا لینے کے لئے ہاتھ پھیلایا۔ آپ نے علی کو بلایا۔ ان کو آشوبِ چشم تھا۔ آپ نے ان کی آنکھوں پر اپنا تھوک لگا دیا اور اپنا جھنڈا ان کو دیا۔

(تاریخ طبری، حصہ اول، (ص ۳۵۹)

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"آنحضرت نے ابوبکر کو سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ لیکن وہ ناکام آئے پھر حضرت عمر مامور ہوئے۔ اور برابر دو دن جاکر لڑے لیکن دونوں دن ناکام رہے۔ آنحضرت نے یہ دیکھ کر فرمایا۔ کل میں ایسے شخص کو علم دوں گا جو حملہ آور ہوگا۔ اگلے دن تمام اکابر صحابہ علم نبوی کی امید میں بڑے سروسامان سے ہتھیار سج کر آئے۔ ان میں حضرت عمر بھی تھے اور ان

کا خود بیان ہے کہ میں نے کبھی اس موقعہ کے سوا علم برادری اور افسری کی آرزو نہیں کی۔ لیکن قضاء قدر نے یہ فخر حضرت علی کے لئے اٹھا رکھا تھا۔

(الفاروق، علامہ شبلی نعمانی ناشر محمد دین اینڈ سنز لاہور ص ۱۶۱)

شاہ ولی اللہ ازالۃ الخفاء میں فضائل حضرت عمرؓ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حضرت عمر فاروق بعض ایام خیبر میں امیر لشکر بھی رہے اور فتح کرنے میں بہت کچھ جدو جہد کی گو عاقبت الامر فتح حضرت علی مرتضٰے کے ہاتھ پر ہوئی اور بلحاظ فضیلت کے اس واقع میں آپ غالب رہے۔ حضرت علی مرتضٰے فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت خیبر کے قریب پہنچے تو آپؐ نے حضرت عمر فاروق کو لوگوں کے ساتھ خیبر کی طرف بھیجا اور لڑائی ہوئی یہاں تک کہ اہل خیبر نے حضرت عمر فاروق کو اور ان کے ساتھیوں کو شکست دی۔ اور وہ لوٹ کر آئے لوگ انہیں بزدل کہتے تھے اور وہ لوگوں کو۔ حاکم نے اس کی تخریج کی ہے۔ یہ حضرت علی مرتضیٰ نے مبالغتہً فرمایا۔ کیونکہ مقصود اس جگہ مقابلہ کرنے سے تھا۔ لہٰذا ترک مقابلہ کو آپ نے خیانت و بزدلی سے تعبیر کیا۔"

(ازالۃ الخفاء مقصد دوم شاہ ولی اللہ، محمد سعید اینڈ سنز کراچی ص ۸۵)

شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی مورخین کی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ حضرت عمرؓ امیر لشکر بن کر جنگ کے لئے گئے۔ مگر بغیر فتح حاصل کئے واپس آئے اور فتح حضرت علی کے ہاتھ سے ہوئی۔ اب یہ شاہ صاحب کی عقیدت کی بات کہ انہوں نے مورخین کی زبان میں بات نہیں کہی۔ اگر عقیدت کا مسئلہ نہ ہو تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کوئی شخص امیر لشکر بن کر جائے۔ جنگ کرے اور بغیر فتح کے واپس آجائے

اور اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہ ہو تو سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس میں یا اس کے لشکر میں مزید جنگ کا حوصلہ نہ تھا اور وہ شکست کھا کر میدان چھوڑ کر بھاگ آیا۔ اور اگر بعد میں جانے والا امیر لشکر اسی شکست خوردہ فوج کو لیکر جائے اور فتح حاصل کر لے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ پہلے جو شکست ہوئی تو وہ امیر لشکر کی بزدلی کی وجہ سے ہوئی۔

فتح مکہ

رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ اس غزوہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت صرف یہ بتائی جاتی ہے کہ

جب جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے بیعت لے رہے تھے تو آپ آنحضرت کے قریب نیچے بیٹھے ہوئے بیعت کرا رہے تھے اور ابن اثیر کے مطابق:

"آپ نے حضرت عمر سے کہا کہ تم عورتوں سے بیعت لو پھر آپ نے سب عورتوں کے لئے دعائے مغفرت کی۔ رسول اللہ عورتوں کو کبھی چھوتے نہیں تھے اور نہ ان سے مصافحہ کرتے تھے۔ سوائے ان کے جن کو اللہ تعالی نے آپ کے لئے حلال فرمایا تھا۔ یا محرمات سے تھیں۔"

(اردو ترجمہ تاریخ کامل، ابن اثیر، دائرۃ معین المعارف ص ۱۵م)

مولانا شبلی نعمانی نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"حضرت عمر آنحضرت سے قریب لیکن کسی قدر نیچے بیٹھے تھے جب عورتوں کی باری آئی تو چونکہ آنحضرت صلعم بے گانہ عورت کو ہاتھ سے

مس نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمر کو ارشاد فرمایا کہ تم ان سے بیعت لو۔ چنانچہ تمام عورتوں نے انہیں کے ہاتھ پر آنحضرت سے بیعت کی۔"
(الفاروق)

آنحضرت کے ساتھ لگے رہنا، مگر سوچ بوجھ کے ساتھ، حضرت عمرؓ کا عام انداز تھا۔ لہٰذا وہ یہاں پر بھی کارِ بیعت میں معاونت کے لئے قریب موجود تھے۔ مگر یہ روایت کہ آنحضرت نے خود تو نامحرم عورتوں کی بیعت سے گریز کیا۔ مگر یہ خدمت حضرت عمر کے سپرد کر دی ناقابلِ فہم ہے۔

غزوہ حنین

شوال ۸ھ میں غزوہ حنین ہوا۔ اس غزوہ کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی کے بقول مسلمانوں نے پہلے حملے میں دشمن کو بھگا دیا۔ مگر پھر مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہوئے تو دشمن نے حملہ کیا اور اس قدر تیر برسائے کہ مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی۔ اور بارہ ہزار آدمیوں میں سے چند حضرات کے سوا باقی سب بھاگ گئے۔

مولانا شبلی نعمانی طبری اور ابن اسحاق کے حوالہ سے مزید لکھتے ہیں کہ ثابت قدم رہنے والوں میں حضرت عمر ابن خطاب بھی تھے۔ مگر بخاری کے مطابق صورتِ حال یہ تھی۔

ابو قتادہ روایت کرتے ہیں کہ:

انھزم المسلمون وانھزمت معھم فاذا بعمر بن الخطاب فی الناس فقلت لہ ما شان الناس۔ قال امر اللہ ثم تراجع الناس الی رسول اللہ۔

(غزوہ حنین میں) مسلمان بھاگ گئے تو میں بھی ان کے ساتھ بھاگا۔ بھاگنے والوں میں حضرت عمر ابن خطاب بھی تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ لوگوں کا کیا حال ہے۔ کہا اللہ کی مرضی۔ پھر سب لوگ رسول اللہ کی طرف پلٹ کر آئے۔

(صحیح بخاری پ ۱۷ ص ۵۰ کتاب المغازی)

اکثر مورخین و محدثین لکھتے ہیں کہ مسلمان بڑے بدحواس ہو کر بھاگے محض چند افراد ثابت قدم رہے۔ رسولؐ اللہ آواز دیتے رہ گئے کہ اے بیعت رضوان والو! تم اپنے رسول کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو مگر کسی نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ثابت قدم رہنے والوں میں عام طور سے جو نام ملتے ہیں وہ یہ ہیں۔

جناب عباس۔ علی۔ عقیل۔ فرزند حارث۔ عبداللہ ابن زبیر زبیر بن العوام۔ اسامہ بن زید اور عبداللہ بن مسعود۔

ہم نے غزوات کے حوالہ سے حضرت عمرؓ کی دینی خدمات کا جائزہ لیا۔ اب ہم سرایا کے حوالہ سے حضرت عمر کی خدمات کا جائزہ لیں گے۔ سرایا کی فہرست میں صرف ایک سریہ ایسا ہے کہ جو آپ کی ماتحتی میں بھیجا گیا۔ یہ تاریخ میں سریہ عمر ابن خطاب کے نام سے موسوم ہے اور یہ مہم بنی عامر کے مقام تربہ کو گئی تھی۔ سریہ ذات السلاسل میں بھی آپ تشریف لے گئے تھے تفصیل یہ ہے۔

"جمادی الآخر میں رسول اللہ صلعم نے عمرو بن العاص کو تین سو صحابہ کے ساتھ بنی قضاعہ کے مقام سلاسل کو بھیجا۔ اس مہم کی وجہ یہ ہوئی کہ ام العاص بن وائل قبیلۂ قضاعہ کی تھی۔ بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے چاہا کہ اس طرح آپ بنی قضاء کی تالیف قلوب کریں

آپ نے عمر بن العاص کو اشرافِ مہاجرین اور انصار کے ساتھ ان کی طرف روانہ کیا۔ پھر عمرو بن العاص نے آپ سے مدد طلب کی۔ آپ نے دو سو مہاجرین اور انصار کو جن میں ابوبکر اور عمر بھی تھے ابوعبیدہ بن الجراح کی امارت میں ان کی مدد کو بھیجا .... اور بھیجتے وقت ابوعبیدہ سے کہا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے خلاف نہ ہونا ابوعبیدہ عمرو بن العاص کے پاس پہنچے۔ عمر بن العاص نے ان سے کہا تم میری مدد کے لئے آئے ہو۔ ابوعبیدہ نے کہا۔ عمرو رسول اللہ صلعم نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میرے تمہارے درمیان اختلاف نہ ہو اگر تم میری بات نہ مانو، نہ مانو۔ میں تمہاری اطاعت کروں گا۔ عمرو بن العاص نے کہا میں تمہارا امیر ہوں اور تم میرے مددگار۔ ابوعبیدہ نے کہا یہی سہی، چنانچہ اب عمرو بن العاص نے نماز میں امامت کی۔"

تاریخ طبری، ص ۳۷۶)

اس مہم میں حضرت عمر کو ابوعبیدہ بن الجراح کی ماتحتی میں بھیجا گیا اور پھر وہ عمرو بن العاص کے پاس پہنچ کر ان کی ماتحتی میں آگئے۔ ابوعبیدہ نے تو حکم رسول کا پاس کرتے ہوئے عمرو بن العاص کی اطاعت قبول کر لی۔ مگر حضرت عمر نے اپنے مزاج کے مطابق عمرو کے ایک حکم پر اعتراض کیا۔ علامہ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں کہ:

ترجمہ: سریہ ذات السلاسل میں عمرو بن العاص نے فوج کو حکم دیا کہ کوئی شخص آگ نہ روشن کرے۔ اس پر حضرت عمر نے اعتراض کیا کہ عمرو بن العاص اس سے کیوں منع کرتا ہے۔ تو ان سے حضرت ابوبکر نے کہا تم چپ رہو۔ کیونکہ رسول اللہ نے اسی وجہ سے تو عمرو بن العاص کو ہم لوگوں کا سردار بنا کر بھیجا ہے کہ اس کو فن حرب کا علم ہم لوگوں

سے زیادہ ہے تب حضرت عمر خاموش ہوئے۔۔۔۔۔۔

(فتح الباری۔ کتاب الغزوات پارہ ۱۷ ص ۶۷)

روضتہ الاحباب کے مطابق: عمرو بن العاص گفت ہیچ احدے آتش روشن نہ کند الاکہ اورا در آتش اندازم در روایتے آں کہ عمر فاروق برعمرو انکار کرد و سخن درشت گفت۔ عمرو گفت اے عمر مامور شدہ بہ آں کہ سخن من بشنوی و فرمان بری۔ جواب داد کہ آرے۔ عمرو گفت پس بآں امر ممتثل شود ابوبکر با عمر گفت بگذار اورا بحال خود۔ بدرستی کہ جناب رسول خدا ویرا برما امیر نگردانیدہ مگر بجہتہ آں کردے مصلحت حرب را نکو می داند۔

ترجمہ: عمرو بن العاص نے کہا کہ کوئی شخص آگ نہ روشن کرے ورنہ میں اس کو آگ میں جھونک دوں گا۔ (ایک روایت میں ہے کہ) عمر فاروق نے عمرو کی بات پر انکار کیا اور سخت بات کہدی تو عمرو نے کہا کہ اے عمر تم میرے ماتحت کئے گئے ہو تا کہ تم میری بات سنو اور میری اطاعت کرو۔ عمر نے جواب دیا ہاں۔ عمرو نے کہا بس یہ تو حکم ماننے کے قابل ہے اور ابوبکر نے عمر سے کہا ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو کیونکہ جناب رسول خدا نے ان کو ہمارے اوپر امیر اسی لئے بنایا ہے کہ وہ جنگی مصلحتوں کو بہتر سمجھتے ہیں۔

(روضہ الاحباب جلد ۱ ص ۴۱۳)

اس سے قبل غزوات میں حضرت عمر نے جو کچھ کیا وہ بھی آپ نے پڑھ لیا۔ اور سرایہ میں آپ کی کیا حیثیت تھی۔ یہ بھی معلوم ہو گیا۔ آپ میں نہ تو اطاعت کا حوصلہ تھا اور نہ ہی فن حرب اور جنگی چالوں میں مہارت۔

حفصہ بنت عمر کا رسُول اللہ سے نکاح

شعبان ۳ھ میں حضرت عمر کو جناب رسول خدا کا خسر بننے کا شرف حاصل ہوا۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔

حضرت حفصہ کے بیوہ ہوجانے کے بعد حضرت عمر کو ان کے نکاح کی فکر ہوئی۔ سوء اتفاق سے اسی زمانہ میں حضرت رقیہ کا انتقال ہو چکا تھا اس بناء پر سب سے پہلے حضرت عمر نے ان کے نکاح کی خواہش حضرت عثمان سے کی۔ انہوں نے کہا میں اس معاملہ میں غور کروں گا۔ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے ذکر کیا۔ انہوں نے خاموشی اختیار کی حضرت عمر کو ان کی بے التفاتی سے رنج ہوا۔ اس کے بعد خود جناب رسالت پناہ نے حضرت حفصہ سے نکاح کی خواہش کی، نکاح ہو گیا۔

(سیرت النبی حصہ اول، جلد۲ ص ۴۰۸، ۴۰۹ مطبع معارف اعظم گڈھ (بھارت) سن اشاعت ۱۳۲۹ھ)

علامہ ابن حجر کی اصابہ جلد ۸، اور علامہ دیار بکری کی تاریخ خمیس جلد۲ کے مطابق حضرت عمر نے حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان کے رویہ سے رنجیدہ ہوکر اپنی بیٹی کا ذکر خود جناب رسول خدا سے کیا تو آپ نے حضرت حفصہ کو شرف زوجیت بخشا۔

اللہ کے رسول کی آخری خدمت

حضرت عمرؓ نے آنحضرت کے ایام علالت میں ان کی کیا خدمت کی یہ کسی تاریخ سے معلوم نہیں ہوتا۔ اگر معلوم ہوتا ہے تو بس اتنا کہ آپ نے ان ایام میں آنحضرت کی حکم عدولی کی ، اور آپ کے طرز عمل سے ان کو اذیت پہنچی ۔ جیش اسامہ کے ساتھ جانے کا حکم دیا، تو نہیں گئے جب کاغذ قلم دوات مانگا تو نہیں دینے دیا۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک المناک واقعہ ہے۔ جسے حدیث قرطاس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس واقعہ کو بخاری، مسلم، احمد ابن حنبل اور مورخ طبری نے لکھا ہے۔

طبری کے مطابق :

ابن عباس نے کہا ایک دن جمعرات کو رسول اللہ صلعم پر مرض کی شدت ہوئی۔ آپ نے فرمایا لاؤ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں تاکہ بعد میں تم گمراہ نہ ہو۔ اس پر صحابہ میں تنازعہ ہوا۔ حالانکہ اللہ کے نبی کے پاس کسی قسم کا تنازعہ نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اس میں بعض لوگوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے اور آپ پر سرسامی کیفیت طاری ہے۔ پہلے دریافت کر لو۔ اس سے آپ کا منشا کیا ہے صحابہ نے اس کا مطلب دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ جس حال میں میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے۔ جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔ پھر آپ نے تین باتوں کی وصیت کی۔ ایک یہ کہ مشرکوں کو تمام جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ جو وفد آئے اسے ہی صلہ دیا جائے جو میں دیا کرتا تھا۔ تیسری بات آپ نے عمداً بیان

نہیں کی یا خود مجھے اب یاد نہیں رہی کہ وہ کیا تھی۔

تھوڑی سی تبدیلیٔ الفاظ کے ساتھ یہ حدیث دوسرے سلسلہ سے بھی ابن عباس سے مروی ہے کہ جمعرات کے واقعے کو دریافت کیا جاتا ہے وہ یہ تھا کہ ایک دن جمعرات کو آپ کی طبیعت ناساز ہوئی، یہ کہہ کر وہ رونے لگے اور ان کے آنسو موتی کی لڑی کی طرح رخساروں پر سے جاری ہوگئے۔ پھر کہا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میرے پاس تختی اور دوات لے آؤ یا آپ نے فرمایا کہ ایک پارچہ اور دوات لے آؤ۔ میں ایک تحریر لکھ دوں۔ تاکہ تم پھر راہ راست سے نہ بھٹک سکو اس پر لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ کو ہذیان ہوگیا ہے۔

(تاریخ طبری، حصہ اول، ص ۵۲۰)

صحیح بخاری کے مطابق:

عن ابن عباس قال لما اشتدّ بالنبی وجعہ قال ائتونی لکتاب اکتب لکم کتاباً لا تضلوا بعدہ قال عمران النبی غلبہ الوجعہ وعندنا کتاب اللہ حسبنا فاختلفوا وکثر اللفظ قال قوموا عنی ولا ینبغی عندی التنازع فخرج ابن عباس یقول ان الرزیۃ کل الرزیۃ ماحال بین رسول اللہ وبین کتابہ۔

ابن عباس فرماتے تھے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض شدید ہوگیا تو فرمایا۔ میرے پاس کاغذ لاؤ میں تمہیں ایسی تحریر لکھ دوں کہ تم پھر گمراہ نہ ہوگے۔ عمر نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درد کا غلبہ ہے اور ہمیں کتاب خدا کافی ہے۔ پھر لوگوں نے اختلاف کیا اور شور و غل زیادہ ہوا تو رسول اللہ نے فرمایا میرے پاس سے چلے جاؤ۔ میرے پاس جھگڑا کرنا

مناسب نہیں۔ پھر ابن عباس یہ کہتے ہوئے نکلے کہ پوری مصیبت یہ ہے کہ جو حائل ہوئی رسول اللہ اور ان کی تحریر کے درمیان۔

(صحیح بخاری باب کتابۃ العلم پ۱ ص ۱۰۶)

صحیح مسلم کے مطابق :

عن ابن عباس قال لما حضر رسول اللہ وفی البیت رجال فیہم عمر بن الخطاب فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ھلم اکتبُ لکم کتابا لا تضلون بعدہ فقال عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد غلب علیہ الوجع و عندکم القرآن حسبنا کتاب اللہ فاختلف اھل البیت فاختصموا فمنھم من یقول قربوا یکتب لکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتابا لن تضلوا بعدہ و منھم من یقول ما قال عمر فلما اکثروا اللغو والاختلاف عند رسول اللہ قال رسول اللہ قوموا عنی قال عبید اللہ فکان ابن عباس یقول ان الرزیۃ کل الرزیۃ ما حال بین رسول اللہ و بین أن یکتب لھم ذلک الکتاب من اختلافھم و لغطھم۔

جناب ابن عباس سے مروی ہے کہ جب جناب رسول خدا کا مرض الموت قریب ہوا تو رسول اللہ کے گھر میں حضرت عمر ابن خطاب اور دوسرے لوگ جمع تھے۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ آؤ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں۔ تاکہ تم اس کے بعد گمراہ نہ ہو۔ اس پر حضرت عمر نے کہا کہ رسول اللہ پر درد کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے۔ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ اس پر گھر میں موجود لوگوں میں اختلاف ہوا اور جھگڑنے لگے۔ بعض کہتے تھے کہ رسول اللہ وہ تحریر لکھ دیں کہ جس کے بعد ہم لوگ گمراہ نہ ہوں اور ان میں سے بعض حضرت عمر کے ہم زبان تھے۔ پھر جب

رسول اللہ کے پاس بہت شور ہونے لگا۔ اور اختلاف بڑھنے لگا تو آپ نے فرمایا۔ میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔ ابن عباس کہا کرتے تھے کہ وہ پوری مصیبت تھی۔ کہ جو ان کے شور وغل اور اختلاف کی وجہ سے رسول اللہ اور ان کے ارادے تحریر کے درمیان حائل ہوئی۔

(صحیح مسلم جلد ۲، مطبوعہ مصر سن اشاعت ۱۳۴۹ھ ص ۶۹ ق)

احمد بن حنبل کے مطابق:

حدثنا عبداللہ حدثنی ابی ثنا موسیٰ بن داؤد حدثنا ابن لھیعہ عن ابی الزبیر عن جابر ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم دعا عند موتہ بصحیفۃ لیکتب فیہا کتابًا لا یضلون بعدہ قال فخالف علیہا عمر بن الخطاب حتی رفضہا۔

امام احمد بن حنبل سے عبداللہ نے ان سے، ان کے باپ نے ان سے، موسیٰ بن داؤد نے ان سے ابن لھیعہ نے ان سے ابو الزبیر نے اور ان سے جابر بن عبداللہ انصاری نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے قریب کاغذ مانگا۔ اس میں لکھوانے کے لئے تاکہ وہ اس کے بعد گمراہ نہ ہوں۔ عمر بن خطاب نے ان کی مخالفت کی یہاں تک کہ اسے چھین لیا۔

(مسند احمد ابن حنبل جلد ۳ مطبوعہ مصر ص ۳۴۶)

اس مسئلہ پر سبھی مسلمانوں کے درمیان مدتوں سے طول طویل بحثیں ہو رہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ مسلمان حضرت عمر سے انتہائی عقیدت کی وجہ سے یہ نہیں چاہتے کہ تاریخی حقیقتیں سامنے آئیں اور پھر یہ کہ شیعوں سے تنازع کی بناء پر تاریخی مسئلے قومی غیرت کے مسئلہ بن گئے ورنہ کسی ایسے واقعہ سے کہ جسے مستند ترین محدثین اور مورخین نے نقل

کیا ہو انکار کرنا یا ایسے نکتے نکالنے کی کوشش کرنا کہ جن سے واقع سے انکار کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔

یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ واقعہ قرطاس کو امام بخاری نے ۷ مقامات پر مختلف سلسلہ رواۃ سے نقل کیا ہے اور ہر سلسلہ ابن عباس رض تک پہنچتا ہے۔ اس طرح سے امام مسلم اور طبری کے بھی آخری راوی ابن عباس ہیں۔ اس بات کے پیشِ نظر یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ہر سلسلہ کے آخری راوی ابن عباس ہی ہیں۔ ہم نے احمد بن حنبل کی وہ روایت بھی نقل کردی ہے کہ جس کے راوی حضرت جابر بن عبداللہ انصاری ہیں۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ ــــــــــــــــــــــــــ

ــــــــــ بخاری، مسلم، احمد بن حنبل جیسے محدثین اور طبری جیسے مورخ نے یہ واقعہ نقل کرنے میں کوئی قباحت محسوس کی۔ مگر بعد کے مسلمان پریشان ہیں کہ کس طرح سے حضرت عمر رض کے دامن کے داغ کو دھویا جائے۔ اس سلسلہ میں عجیب و عجیب توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس واقعہ سے انکار کی گنجائش نکالی جاتی ہے۔

اگر اس قسم کے واقعات کو خالص سیاسی نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی کتاب امہات الامہ میں گروہی عقیدت سے ہٹ کر اس واقعہ کے پس منظر اور نتیجہ پر خاصی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ جسے ہم قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

اس بات کے جتانے کی کچھ ضرورت نہیں کہ ابوبکر اور عائشہ باپ بیٹی ایک فریق تھے اور علی اور فاطمہ میاں بی بی ایک فریق، پیغمبر صاحب کے سامنے ہر ایک فریق اپنی اپنی جگہ قائم تھا .... پیغمبر صاحب

۲۲ صفر سنہ ۱۱ھ روز شنبہ کو بیمار پڑے...... عباس نے علی سے کہا اب پیغمبر صاحب کا وقت اخیر ہے۔ تم سامنے سے ٹلو مت عجب نہیں تمہارے مفید مطلب کچھ وصیت کر مریں۔ چنانچہ علی سامنے جا کھڑے ہوئے۔ پیغمبر صاحب نے آنکھ کھولی علی کو کھڑا پایا۔ فرمایا ایتونی بقرطاس اکتب لکم کتابا لن تضلو بعدی ابد (میرے پاس کاغذ لاؤ کہ میں تمہیں وہ بات لکھ دوں جس کی وجہ سے تم میرے بعد کبھی جادہ مستقیم سے منحرف نہ ہو) اس پر حاضرین میں ہوا اختلاف۔ بعض نے کہا وصیت لکھوا لینی چاہیئے اور بعض نے جس میں بڑے وزن دار بات کے دھنی عمر تھے منع کیا اور کہا حسبنا کتاب اللہ (ہم کو کتاب اللہ بس کرتی ہے) اس پر پیغمبر صاحب نے ناخوش ہو کر سب کو اپنے پاس سے اٹھوا دیا۔ پھر پیغمبر صاحب نے نہ تو وصیت کا خیال فرمایا اور نہ قضا نے ان کو مہلت ہی دی۔ ...... عائشہ شروع علالت سے پاس سے نہ کھسکیں.... واقعہ قرطاس نے بھانڈا پھوڑا کہ اول دن سے رو کاوٹوں کی کھچڑی خلافت کے لئے پک رہی تھی۔ جن کے دل میں تمنائے خلافت چٹکیاں لے رہی تھی۔ انہوں نے تو دھینگا مشتی سے منصوبہ ہی کو چٹکیوں میں اڑا دیا اور مزاحمت کی تاویل یہ کی کہ ہماری ہدایت کے لئے قرآن بس کرتا ہے اور چونکہ اس وقت پیغمبر صاحب کے حواس بر جا نہیں کاغذ قلم دوات کا لانا کچھ ضروری نہیں۔ خدا جانے کیا کا کیا لکھوا دیں گے.....

...... پیغمبر صاحب کے انتقال سے سبھی کو قلق ہوا ہوگا۔ مگر بڑا قلق فاطمہ کا تھا کہ ان کے حق میں گویا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ انہوں نے باپ کے مرنے کا اتنا رنج کیا اور کرنا ہی تھا کہ چھ مہینہ کے

اندر اندر گھل گھل کر مر گئیں اور جتنے دن جئیں ہنسنا تو در کنار مسکرائیں تک نہیں۔ ہم کو جب فاطمہ زہرا کا خیال آتا ہے تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ علی کو خلافت مل جاتی تو غم زدہ فاطمہ کی کچھ تو دلجوئی ہو جاتی۔
.... عائشہ سوکنوں کے بارے میں اس قدر حد سے بڑھ چلی تھیں کہ پیغمبر صاحب خدیجہ کا ذکر خیر کرتے تو کہتیں کہ میرے سامنے کیا اس بوڑھی دہا حِن بچہ کش کے مرنے کا افسوس کیا کرتے ہو۔ خدا نے تم کو اس سے بہتر بی بی دی ہے، یعنی میں۔ بھلا ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ فاطمہ اور علی کے ساتھ خاطر مدارات سے پیش آتی ہوں گی۔ مگر ہاں یوں کہو کہ پیغمبر صاحب کی زندگی میں ان کی عنایت خاص کے ہوتے علی اور فاطمہ کو عائشہ یا کسی اور کی پروا ہی کیا تھی۔ عائشہ اور علی میں جو دلی کدورت تھی اور اسی کدورت کی وجہ سے جنگ جمل کا وقوع ہوا تھا جس میں طرفین کے ۱۳ ہزار آدمی مارے گئے تھے اور مقتولین عوام الناس نہیں بلکہ اکثر صحابی اور عباد اور حفاظ۔ اہل سنت بے تامل کہہ دیں گے کہ علی اور عائشہ میں کچھ بھی رنجش نہ تھی۔ لوگوں کے بہکانے سکھانے سے دونوں لشکروں میں اتفاقیہ مٹھ بھیڑ ہو گئی۔ ہم مانتے ہیں کہ اہل سنت کا یہ کہنا محض اس غرض سے ہے کہ عائشہؓ اور علیؓ کے مذہبی تقدس میں فرق نہ آئے۔ لیکن جو حقیقتہ الحال سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے۔

(امہات الامۃ ص ۹۸ تا ۱۰۲ مطبوعہ دہلی)

بعدِ وفاتِ رسولؐ

رسول اللہ کی آنکھ بند ہوئی اور وہ وقت آگیا کہ جس کا حضرت عمرؓ اور ان کے دوستوں کو انتظار تھا۔ اتفاق کی بات کہ جس وقت آنحضرتؐ نے انتقال فرمایا تو حضرت عمر کے سب سے بڑے مربی ابو بکرؓ اپنے گھر میں تھے کہ جو مدینہ سے تقریباً دو میل دور محلہ سنح میں تھا۔ لہٰذا حضرت عمر نہیں چاہتے تھے کہ حضرت ابوبکر کی عدم موجودگی میں رسول اللہ کی وفات کی خبر عام ہو اور خلافت کا مسئلہ چھڑ جائے۔ لہٰذا انہوں نے فوراً ڈرامہ شروع کر دیا۔ اس کی تفصیل طبری کی زبانی سنیئے۔

ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد عمر نے کھڑے ہو کر کہا کہ بعض منافق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کا انتقال ہوگیا۔ حالانکہ آپ مرے نہیں ہیں۔ بلکہ اپنے رب کے پاس گئے ہیں جس طرح کہ موسیٰ بن عمران چالیس راتوں کے لئے اپنی قوم سے غائب ہو کر اللہ کے پاس چلے گئے تھے اور پھر چلے آئے۔ حالانکہ ان کے متعلق بھی ان کی قوم والوں نے یہی کہا تھا کہ وہ مر گئے۔ بخدا رسول اللہ صلعم ضرور واپس آئیں گے۔ اور جو لوگ آپ کے مرنے کی خبر مشہور کر رہے ہیں، ان کے ہاتھ پاؤں قطع کریں گے۔ تاریخ طبری (حصہ اول ص ۵۲۷)

جیسے ہی حضرت ابوبکر تشریف لائے سارا ڈرامہ ختم ہو گیا۔ پڑھنے والے ہمیں معاف فرمائیں۔ ہم نے یہ لفظ " ڈرامہ " مجبوراً استعمال کیا کہ ہمیں اور کوئی مناسب لفظ نہیں ملا کہ جس سے حضرت عمر کی اس کیفیت کی ترجمانی ہوتی ہو۔ ذرا غور فرمایئے کہ حضرت عمر جیسا مضبوط اعصاب

کا مالک، سخت دل النسان، رسول اللہ کی وفات کی خبر سنتے ہی اتنا بدحواس ہوا کہ اسے قرآن کی آیت بھی یاد نہیں رہی کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اور پھر یہ بھی نہیں ہوا کہ رسول اللہ کی وفات کی خبر اچانک ملی۔ اور حضرت عمر ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ رسول اللہ تو دس بارہ دن مسلسل بیمار رہے، پھر دنیا سے رحلت فرمائی۔ اور یہ ہوش و حواس کیسے گئے تھے کہ حضرت ابوبکر کے آتے ہی لوٹ آئے۔ انہوں نے قرآن کی آیتیں یاد دلائیں تو فوراً یاد آگئیں۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ وفات پاگئے تو ان کی گردن نہیں ماری بلکہ فوراً مان لیا کہ ہاں وفات پاگئے۔

یہاں سے یہ دونوں صاحبان سقیفۂ بنو ساعدہ پہونچے۔ جہاں حصولِ خلافت کے لئے اچھی خاصی دھینگا مشتی ہوئی۔ یہاں بھی حضرت عمر کا ڈرامائی انداز کام آیا۔ حضرت عمر نے سمجھ لیا کہ اب باتوں سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ چنانچہ اسی ہڑبونگ میں آپ نے جھٹ سے حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر فوراً عبیدہ بن الجراح نے حضرت عمر کی تائید کی اور پھر دوسرے لوگوں نے بیعت کرلی۔ یہ وہ تاریخی حقیقتیں ہیں کہ جن سے انکار ممکن نہیں۔

اس ابتدائی مرحلہ سے فارغ ہو کر حضرت عمر نے خلافت ابوبکر کے استحکام کی فکر کی اور اس میں بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور وہی کیا کہ جو کسی مطلق العنان حاکم کے حواری کیا کرتے ہیں۔ بنت رسول کے دروازے پر کھڑے ہو کر ان کا گھر پھونکنے کی دھمکی دی۔ انہیں یہ سوچنے کی کیا ضرورت تھی کہ ہم جس در پر کھڑے ہو کر گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دے رہے ہیں، یہ وہی در ہے جہاں جناب رسول خدا کھڑے ہو کر سلام کرتے اور اس گھر کے لئے دعائے خیر کرتے۔ پھر اجازت لیکر

اندر داخل ہوتے۔ اس وقت حضرت عمرؓ کے جذبات خالص سیاسی فکر کے طابع تھے۔ انہیں اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ یہ دین دنیا کے بادشاہ کی بیٹی کا گھر ہے اور یہ وہ عزت مآب بیٹی ہے کہ جس نے اپنی پارسائی کے سبب خاتون جنت کا لقب پایا۔ اور اس کے قابل صد احترام باپ نے فرمایا تھا کہ فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ جس نے اسے دکھ پہنچایا اس نے مجھے دکھ پہنچایا۔

اس وقت حضرت عمر کے پیش نظر سیاسی اخلاقیات تھیں کہ جن کا معیار جدا ہوتا ہے۔ دنیا میں ایسا ہوتا چلا آیا ہے کہ ایک بادشاہ کے مرنے کے بعد تخت کے امیدوار پرسے داری کے چکر میں نہیں پڑتے، پہلے تخت و تاج کی فکر کرتے ہیں اور اگر ضروری سمجھتے ہیں تو متوفی بادشاہ کے ورثاء پر تعدی بھی کرتے ہیں اور پھر کبھی موقع ملتا ہے تو تعزیت بھی ہو جاتی ہے اور معذرت بھی کر لیتے ہیں۔ حضرت عمر نے بھی یہی کیا۔ فاطمہ کے عظیم باپ کی دینی حیثیت اور مرتبہ کو بھلا کر فاطمہؑ کے مقدس گھر کو پھونک دینے کی دھمکی دی اور پھر جب خلافت کے جھنجھٹ سے ذرا جان چھوٹی تو حضرت ابوبکر کے ساتھ پرسے داری کے لئے پہنچ گئے مگر بنت رسول نے منہ پھیر لیا اور مرتے دم تک راضی نہ ہوئیں۔ وصیت کر گئیں کہ جنازے میں یہ دونوں شریک نہ ہوں۔

حضرت فاطمہ زہرا کے گھر کو آگ لگا دینے کے سلسلے میں حضرت عمر کی دھمکی کا اقرار محققین کرتے تو ہیں۔ مگر بعض تاویلات کے ساتھ۔

مولانا شبلی نعمانی طبری کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"علامہ طبری نے تاریخ کبیر میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے حضرت فاطمہ کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا کہ یا بنت رسول اللہؐ

خدا کی قسم آپ ہم کو سب سے زیادہ محبوب ہیں. تاہم اگر آپ کے ہاں
اس طرح لوگ مجمع کرتے رہے تو میں ان لوگوں کی وجہ سے گھر میں آگ
لگا دوں گا. اگرچہ سند کے اعتبار اس روایت پر ہم اعتبار ظاہر نہیں کر سکتے
کیونکہ اس روایت کے رواۃ کا حال ہم کو معلوم نہیں ہو سکا. تاہم درایت
کے اعتبار سے اس واقع کے انکار کی کوئی وجہ نہیں. حضرت عمر کی تندی
اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کوئی بعید نہیں. حقیقت یہ ہے کہ اس نازک
وقت میں حضرت عمر نے نہایت تیزی اور سرگرمی کے ساتھ جو کارروائیاں کیں
ان میں گو بعض بے اعتدالیاں پائی جاتی ہوں. لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ان
ہی بے اعتدالیوں نے اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبا دیا. بنو ہاشم کی سازشیں
اگر قائم رہتیں تو اسی وقت جماعت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا."

(الفاروق)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بھی اس دھمکی کا اقرار کرتے ہیں.
"اس دھمکی اور ڈرانے سے ان لوگوں کو ڈرانا منظور تھا کہ اہل خیانت
نے آپ کے مکان کو امن و پناہ کی جگہ جان کر حکم حرم مکہ معظمہ کا دیا
تھا اور وہاں جمع ہو کر خلیفہ اول کی خلافت لوٹ پوٹ کرنے کے واسطے
صلاحیں اور مشورے فساد انگیز کرتے تھے اور فتنہ اٹھانا چاہتے تھے."

(تحفہ اثنا عشریہ از شاہ عبدالعزیز دہلوی، ناشر اصح المطابع
کراچی ص ۶۰۵)

اور گبن کے مطابق:

The Hashimites alone declined the oath of fidelity, and their chief, in his own house maintained above six months a sullen and independent reserve; without listening to the threats of omer who attempted to

consume with fire the habitation of the daughter of the apostle.

(Decline and Fall of the Roman Empire Vol-III P.519)

مولانا شبلی نعمانی اور شاہ عبدالعزیز، حضرت عمرؓ کی دھمکی کا اقرار تو کرتے ہیں مگر تاویلات کے ساتھ اور یہ ان کے مسلک کی مجبوری ہے۔ یہ تاویلات ایسی ہیں کہ جن کی کوئی بنیاد نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گبن نے کہ جس کے ساتھ کوئی مجبوری نہیں تھی صاف الفاظ میں بات کہہ دی۔

شبلی صاحب حضرت عمر کی بعض بے اعتدالیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"کہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان ہی بے اعتدالیوں نے اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبا دیا۔" ہم عرض کرتے ہیں کہ مومن کی تو یہ شان بتائی جاتی ہے کہ وہ اعتدال میں رہتا ہے۔ مگر یہ تو مستقبل کے امیرالمومنین تھے انہیں کیا ہو گیا تھا۔ امیرالمومنین اور خلیفہ رسول کی شان تو یہ ہے کہ فتنوں کو دبانا ہو یا کوئی اور مسئلہ ہو، وہ شریعت کے تابع رہتا ہے اور پھر یہ کہ وہ فتنے کون سے تھے؟ مولانا موصوف نے کچھ نہیں بتایا۔ آگے چل کر بنو ہاشم کی سازشوں کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ مگر وہ سازشیں کیا تھیں۔ کچھ نہیں بتاتے۔ شاہ عبدالعزیز نے تو بڑی ڈھٹائی اور بے خبری کا ثبوت دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "ہر اہل خیانت نے آپ کے مکان کو امن و پناہ کی جگہ جان کر حکم مکہ معظمہ کا دیا تھا۔" کتنی عجیب بات ہے کہ فاطمہ جیسی دختر رسول اور علی جیسا برادر رسول ہر اہل خیانت کو اپنے گھر میں جمع ہونے کی اجازت دے دیتا ہے۔ مگر یہ بات

شاہ عبدالعزیز کو عجیب نہیں لگی اور کیوں لگتی۔ انہیں تو بس یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ دامن عمرؓ کو کیسے بچایا جائے۔ افسوس کہ انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ کن حضرات کو اہلِ خیانت کہہ رہے ہیں۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کا حق چھن جانے کے بعد جو حضرات صلاح و مشورے کے لئے خانہ فاطمہؓ میں جمع ہوتے تھے وہ کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ تاریخ الامم والملوک مطبوعہ مصر جلد ص ۱۹۸ کے مطابق، جب حضرت عمر حضرت علی کے مکان پر آئے تو اس وقت طلحہ و زبیر اور کچھ مہاجرین وہاں بیٹھے تھے ...... ظاہر ہے کہ یہ مہاجرین وہی حضرات ہوسکتے ہیں کہ جنہوں نے ابوبکر کی بیعت سے کنارہ کشی کی۔ چنانچہ تاریخ ابوالفدا جلد اول مطبوعہ مصر، ص ۱۵۶ کے مطابق "سوائے ایک جماعت بنو ہاشم اور زبیر اور عتبہ بن ابی لہب اور خالد بن سعید بن العاص اور مقداد بن عمرو اور سلمان فارسی اور ابوذر اور عمار یاسر اور براء بن عازب اور ابی بن کعب کے (جنہوں نے بیعت نہیں کی) اور رغبت رکھتے تھے طرف علی ابن طالب کے"

اگر یہ حضرات اہل خیانت اور فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے والے تھے۔ تو پھر اسلام میں رہ کیا جاتا ہے۔ اس جماعت میں تو عشرہ مبشرہ کے بھی کئی بزرگ تھے اور پھر یہ لوگ علی کی حمایت میں خود علی کے مکان میں جمع ہوئے تھے اور وہاں فاطمہ بنت رسول بھی موجود تھیں۔ اس لحاظ سے یہ دونوں حضرات بھی اہل خیانت اور فتنہ و فساد پھیلانے والوں کی اسی صف میں آجاتے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

بات بہت سیدھی سی ہے کہ بنو ہاشم تو رسول اللہ کے کفن دفن میں لگے رہے اور ادھر سقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت کا فیصلہ ہوگیا۔ مگر

بعض حضرات نے کہ جو علیؑ کا حق پہچانتے تھے۔ ابوبکر کی بیعت نہیں کی۔ ان کا علی کے مکان پر آنا جانا اور صلاح مشورہ کرنا کون سی بری بات تھی کہ جس پر عمرؓ نے گھر جلا دینے کی دھمکی دی اور حضرت علی اور ان کے ساتھیوں کو ابوبکر کے پاس چلنے پر مجبور کیا۔ نہ وہاں کوئی فتنہ تھا نہ فساد۔ سلمان فارسی۔ ابوذر غفاری، مقداد بن عمرو، عمار یاسر، زبیر بن العوام رسول اللہ کے چچا حضرت عباس اور خود حضرت علی۔ کیا ان سب کو اسلام سے زیادہ علی کی خلافت عزیز تھی کہ وہ ایسا عمل کرتے کہ جس کی وجہ سے اسلام کا شیرازہ بکھر جاتا۔ حیرت ہے کہ مولانا شبلی نعمانی اس اندیشہ کا اظہار فرماتے ہیں کہ اگر حضرت عمر سے بے اعتدالیاں نہ ہوتیں تو وہی خانہ جنگیاں ہوتیں کہ جو آئندہ چل کر حضرت علی اور معاویہ کے درمیان ہوتیں۔ مولانا موصوف تو صرف علی اور معاویہ کے درمیان ہونے والی خانہ جنگیوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ مگر ہم حضرت علی کے دور کی تمام خانہ جنگیوں کے حوالے سے گفتگو کئے لیتے ہیں۔ پھر بھی وہ بات ثابت نہیں ہو سکے گی کہ جو شبلی نعمانی چاہتے ہیں۔

حضرت علی کو سب سے پہلی جنگ حضرت عائشہ سے لڑنا پڑی۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ علی کی خلافت قائم ہو چکی تھی (مسلمان اسے خلافت راشدہ شمار کرتے ہیں) اور حضرت عائشہ نے خلیفہ راشد پر خروج کیا۔ علی نے آخری دم تک عائشہ اور لشکر عائشہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ جب بات نہ بنی تو بدرجہ مجبوری جنگ کی۔ معاویہ کے سلسلہ میں یہ ہوا کہ حضرت علی نے بحیثیت خلیفہ راشد معاویہ کو شام کی گورنری سے معزول کیا تو معاویہ نے اسے قبول نہیں کیا۔ لہذا یہاں بھی حضرت علی کو مجبوراً جنگ کرنا پڑی۔ حضرت علی کو تیسری جنگ

خوارج سے کرنا پڑی۔ یہ لوگ صفین میں تحکیم کے مسئلہ پر حضرت علی کے مخالف ہوئے اور ہزاروں کی تعداد میں بمقام نہروان جمع ہو گئے۔ یہاں بھی حضرت علی کا موقف وہی تھا کہ جب تک یہ لوگ فتنہ فساد سے باز رہیں گے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ جب خارجیوں نے فتنہ وفساد برپا کرنا شروع کر دیا تو حضرت علی نے ان کے خلاف جنگ کی اور ایسی جنگ کی کہ ہزاروں میں سے چند زندہ بچے۔

ہم ان جنگوں کے عوامل کی تفصیل میں نہیں گئے۔ کیونکہ پھر بات بہت طویل ہو جائے گی۔ ہمیں تو صرف یہ بتانا تھا کہ علیؑ نے جنگ اس وقت کی کہ جب خلافت راشدہ کے باغی کھلم کھلا میدان جنگ میں آگئے اور ان پر اتمام حجت کا بھی اثر نہ ہوا۔

اس وقت جو بغاوتیں ہوئیں تو وہ حالات کا تقاضا تھا۔ اسلامی مملکت بڑے وسیع وعریض علاقہ پر پھیل چکی تھی اور اتنی مستحکم ہو گئی تھی کہ اسے کوئی بیرونی خطرہ نہیں تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی بعض بڑے صحابہ بڑے جاگیردار بن چکے تھے۔ معاویہ کو تو شام کے بادشاہ کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ ہر گروہ کے اپنے اپنے مفادات تھے۔ مگر رسول اللہؐ کی وفات کے وقت صورت حال بالکل مختلف تھی۔ نبوت کے جھوٹے دعویدار اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ عرب قبائل میں ارتداد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اگر ان حالات میں بھی حضرت علی یا ان کے گروہ سے کہ جن میں عباس۔ زبیر بن العوام۔ سلمان فارسی۔ ابوذر اور مقداد جیسے مخلصین اسلام شامل تھے۔ یہ اندیشہ ہو کہ وہ خلیفہ وقت کے خلاف سازشیں کریں گے یا کھلم کھلا بغاوت پر اتر آئیں گے۔ کتنی غلط بات ہے۔

بنت رسول کے حضور حضرت عمرؓ کی گستاخی اور حضرت علیؑ اور ان

کے ساتھیوں پر جبر و تشدد کو جائز قرار دینے کے لئے حضرت علیؓ اور اسلام سے مخلص صحابہؓ فسادی اور سازشی ہونے کا الزام لگانا کسی پڑھے لکھے شریف آدمی کو زیب نہیں دیتا۔

عمرؓ دورِ ابوبکرؓ میں

حضرت ابوبکر نے اپنی خلافت کے قیام کے بعد بھی حضرت عمر کو اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ اُسامہ کا لشکر شام جانے لگا تو ابوبکرؓ نے اسامہ کی اجازت سے عمرؓ کو اپنے پاس روک لیا۔ تاکہ امور مملکت میں آپ کا ہاتھ بٹا سکیں۔ (یہ وہی لشکر تھا کہ جسے رسول اللہ نے وقت آخر فوراً کوچ کا حکم دیا تھا اور اس میں ابوبکرؓ اور عمرؓ کو بھی جانا تھا۔ مگر لشکر نہ جانا تھا نہ گیا اور آنحضرت کی وفات ہوگئی) بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرؓ، ابوبکرؓ پر پوری طرح سے چھائے ہوتے تھے اور ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں دخل دینا ضروری سمجھتے تھے۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ آپ کا تو رسول اللہ کے ساتھ بھی یہی طرز عمل تھا۔ حضرت ابوبکر تو پھر بھی پرانے دوست تھے اور آپ ہی کی کوششوں سے خلیفہ بنے تھے۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر حضرت ابوبکر اہم معاملات میں اپنی کوئی رائے رکھتے تو پھر حضرت عمر کی ایک نہ چلنے دیتے۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ انہیں فی الحال ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے مگر حضرت ابوبکر نہیں مانے۔ لشکر اسامہ کی روانگی کے بارے میں حضرت عمر نے کہا کہ ملتوی کیجئے۔ مگر نہیں چلی۔ پھر کہا کہ اسامہ کے بجائے کسی اور کو سردار لشکر بنا دیجئے تو زبردست ڈانٹ پڑی۔ تاریخ طبری جلد ۲

ص ۲۱۲ پر تو یہاں تک لکھا ہے کہ جب حضرت ابوبکر نے یہ بات سنی تو حضرت عمر کی داڑھی پکڑلی اور کہا کہ اے خطاب کے بیٹے تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے اور تجھے ناپید کرے۔ رسول اللہ تو اسامہ کو سردار مقرر کر کے گئے اور تم مجھے حکم دیتے ہو کہ انہیں معزول کر دوں۔

خالد بن ولید کے لئے تو عمر ابوبکر کے پیچھے ہی پڑ گئے کہ انہیں معزول کر دیجئے۔ مگر ابوبکر انکار ہی کرتے رہے۔ حالانکہ خالد نے بے گناہ مالک بن نویرہ کو قتل کیا تھا اور اس کی حسین بیوی کے ساتھ زنا کیا تھا اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے:

مالک بن نویرہ، بنی یربوع کا بہادر سردار، حسین شاعر اور پر جمال کی بیوی لیلی ام تمیم کا شوہر کہ جس نے رسول اللہ کی وفات کے بعد اپنے زیر اثر قبائل کو حکم دے دیا تھا کہ وہ ابوبکر کو زکات ادا نہ کریں۔ چنانچہ جب خالد بن ولید دوسرے قبائل کی غارت گیری سے فارغ ہوئے اور انہوں نے بنی یربوع کی طرف رخ کیا۔ مالک بن نویرہ کو خالد کی فتوحات اور اپنی طرف آنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے قبائل کو منتشر کر دیا اور خود بھی روپوش ہو گئے۔ جب خالد وہاں پہنچے تو انہوں نے میدان صاف پایا۔ خود ایک جگہ قیام کیا اور فوجی دستے چاروں طرف پھیلا دیئے انہیں میں سے ایک دستہ مالک بن نویرہ کو اس کی بیوی سمیت گرفتار کر کے لایا۔ اسی دستہ میں ایک بزرگ صحابی حضرت ابو قتادہ اور حضرت عبداللہ بن عمر بھی تھے۔ ان دونوں حضرات نے گواہی دی کہ ان لوگوں نے اذان دی اور ہمارے ساتھ نماز پڑھی۔ انہیں معاف کر دیا جائے۔ مگر خالد نے ان کی بات نہیں سنی اور مالک کو قتل کر دیا۔ ان کی بیوی لیلی ام تمیم سے اسی رات زنا کیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس حسین بیوہ

کو خالد کی درندگی کا ایک بڑا کربناک منظر دیکھنا پڑا۔ اس کے محبوب شوہر کے کٹے ہوئے سر کو کہ جس کے بال بڑے اور خوبصورت تھے اس کے سامنے آگ لگائی گئی۔

اس واقعہ پر ابو قتادہ کو بہت دکھ ہوا۔ انہوں نے قسم کھائی کہ اب وہ خالد کے جھنڈے کے نیچے کبھی نہیں لڑیں گے اور فوراً مدینہ روانہ ہو گئے وہاں پہنچ کر حضرت ابوبکر کی خدمت میں خالد کی شکایت کی مگر الٹا آپ ہی کو ڈانٹا گیا تو آپ حضرت عمر کے پاس پہنچے اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔ عمرؓ بہت متاثر ہوئے اور ابو قتادہ کو لے کر سیدھے ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور خالد کو فوراً معزول کر کے سنگسار کرنے کا مطالبہ کیا۔ مگر ابوبکر نہ مانے اور کہا کہ خالد سے تاویل میں غلطی ہوئی۔ جب ابوبکر نہ مانے تو آپ نے کہا کہ اچھا اسے معزول کر دو۔ مگر ابوبکر کا جواب تھا کہ میں اللہ کی تلوار کو نیام میں کیسے پہنچا دوں۔ حضرت عمر بھی خاموش رہنے والے نہیں تھے۔ وہ پیچھے پڑے رہے کہ کم ازکم اسے جواب دہی کے لئے تو بلاؤ۔ چنانچہ خالد بلائے گئے تو اس شان سے آئے کہ زنگاری قبا زیب تن تھی اور عمامہ میں تیر لگے ہوئے تھے۔ مسجد نبوی میں داخل ہوتے تو حضرت عمر ان پر جھپٹ پڑے اور عمامہ سے تیر نکال کر توڑ دیئے اور کہا تو نے ایک مسلمان کو قتل کیا اور اس کی بیوی سے زنا کیا میں تجھے سنگسار کروں گا۔ مگر خالد اس خیال سے کچھ نہ بولے کہ ابوبکرؓ بھی ان کے ہم خیال ہوں گے۔ وہ ابوبکرؓ کی خدمت میں پہنچے اور سارا واقعہ کہہ سنایا اور اپنے کیے کی معافی مانگی ابوبکرؓ نے معاف فرما دیا تو باہر آئے۔ دیکھا کہ عمرؓ مسجد میں ہیں تو ادھر گئے اور کہا کہ ادھر آ۔ اے ام شملہ کے بیٹے۔ حضرت عمر سمجھ گئے کہ ابوبکرؓ نے ان کا قصور معاف کر دیا ہے۔ لہٰذا کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ اپنے

گھر چلے گئے۔

حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں حضرت عمرؓ نے سب سے اہم رائے جو دی وہ جمع قرآن کے سلسلے میں تھی۔ آپ نے ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ قرآنی آیات کو جمع کر کے ان کی شیرازہ بندی کر لی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ حفاظ کی کثیر تعداد کے شہید ہو جانے کے سبب کسی حصہ کے ضائع ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس میں پس و پیش ہوا۔ مگر بالآخر وہ حضرت عمرؓ کی بات مان گئے۔ دراصل حضرت عمرؓ کو یہ فکر اس لئے کرنا پڑی کہ آپ نے حضرت علیؑ سے وہ تعلق نہیں رکھا تھا کہ جو اسلامی تقاضا تھا اور جو علیؑ کا حق تھا۔ حضرت علیؑ کے ہوتے ہوئے قرآن کو کوئی خطرہ نہیں تھا آپ تو پہلے ہی سے جمع قرآن میں لگے ہوئے تھے اور یہ بات حضرت عمرؓ بخوبی جانتے بھی تھے مگر مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ قرآن مجید کے سلسلے میں ادھر رجوع نہ کیا جائے۔

ابوبکرؓ کی وفات اور عمرؓ کی نامزدگی

حضرت ابوبکر سوا دو برس حکومت کرنے کے بعد وفات پا گئے مگر مرنے سے پہلے حضرت عمر کو خلیفہ نامزد کرتے گئے۔ جس دن ابوبکرؓ نے انتقال کیا اسی دن عمرؓ کی بیعت کی گئی۔

مولانا شبلی نعمانی الفاروق میں لکھتے ہیں کہ "وفات کے قریب انہوں نے عام رائے کا اندازہ کرنے کے لئے اکابر صحابہ سے مشورہ کیا۔ سب سے پہلے عبدالرحمٰن بن عوف کو بلا کر پوچھا۔ انہوں نے کہا، عمرؓ کی قابلیت میں کیا کلام ہے۔ لیکن مزاج میں سختی ہے۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا۔ ان کی سختی اس لئے تھی کہ میں نرم تھا۔ جب کام ان پر ہی آپڑے گا۔ خود بخود نرم ہو جائیں گے۔ پھر حضرت عثمان کو بلا کر پوچھا، انہوں نے کہا کہ میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ عمر کا باطن ظاہر سے اچھا ہے اور ہم لوگوں میں ان کا جواب نہیں۔ جب اس بات کے چرچے ہوئے کہ حضرت ابوبکر حضرت عمر کو خلیفہ کرنا چاہتے ہیں تو بعضوں کو تردد ہوا چنانچہ طلحہ نے (جو کہ عشرہ مبشرہ میں ہیں) حضرت ابوبکر سے کہا آپ کے موجود ہوتے عمرؓ کا ہم لوگوں سے کیا برتاؤ تھا۔ اب وہ خود خلیفہ ہوں گے تو خدا جانے کیا کریں گے، اب آپ خدا کے ہاں جاتے ہیں یہ سوچ لیجئے کہ خدا کو کیا جواب دیجئے گا، حضرت ابوبکرؓ نے کہا، میں خدا سے کہوں گا کہ میں نے تیرے بندوں پر اس شخص کو افسر کیا جو تیرے بندوں میں سب سے زیادہ اچھا تھا، یہ کہہ کر حضرت عثمانؓ کو بلایا اور عہد نامہ خلافت لکھوانا شروع کیا، ابتدائی الفاظ لکھوا چکے تھے کہ غش آ گیا۔ حضرت عثمان

نے یہ دیکھ کر یہ الفاظ اپنی طرف سے لکھ دیئے کہ میں عمر کو خلیفہ مقرر کرتا ہوں، تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو حضرت عثمان سے کہا۔ کیا لکھا تھا مجھ کو پڑھ کر سناؤ، حضرت عثمان نے پڑھا تو بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے اور کہا خدا تم کو جزائے خیر دے۔ (الفاروق)

کتنی افسوس ناک صورت حال تھی۔ خاندان رسالت کے ساتھ۔ جس کی جوتیوں کا صدقہ یہ سلطنت تھی۔ اسی کے خاندان والوں کے ساتھ یہ سلوک کہ پہلی خلافت اس خاندان کو مجبور کر کے قائم کی گئی اور دوسری خلافت کے سلسلہ میں اس خاندان سے کوئی بات نہیں پوچھی گئی۔ اگر پوچھی گئی تو حضرت عثمان اور عبدالرحمن بن عوف سے۔ بعض صحابہ نے مخالفت کی تو پرواہ نہیں کی گئی۔ بہر حال اس کے آثار تو پہلی خلافت کے وقت ہی ظاہر ہو گئے تھے۔ اور علیؑ نے عمرؓ سے کہہ دیا تھا کہ اس (خلافت) کا دودھ خوب دوہ لو۔ جس سے تمہیں بھی حصہ ملے۔ اور آج اس خلافت کو ابوبکرؓ کے لئے خوب مضبوط کر دو تاکہ کل ہی وہ اس کو تمہارے حوالے کر دیں۔"

حضرت عمر بحیثیت خلیفہ

عراق پر لشکر کشی

حضرت عمر نے خلافت کے پہلے ہی دن لوگوں سے عراق کی مہم پر جانے کی اپیل کی بڑی کوشش کے باوجود لوگ آمادہ نہ ہوئے۔ بیعت کے لئے آنے والوں کا سلسلہ جاری تھا۔ آپ ان کے سامنے تقریریں کرتے کہ وہ اس جہاد کے لئے آمادہ ہو جائیں مگر تین دن گذر گئے اور کسی کے کان پر جوں نہ رینگی تو آپ نے چوتھے دن بڑی پرجوش تقریر سے لوگوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ ابو عبید بن مسعود ثقفی اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اس کام کے لئے میں حاضر ہوں ان کی دیکھا دیکھی اور لوگوں میں بھی جوش آ گیا۔ چنانچہ ایک لشکر جمع ہو گیا جسے ابو عبید سردار بنو سقیف کی ماتحتی میں عراق کے لئے روانہ کر دیا گیا۔

ابو عبید نے جوش شجاعت میں جنگی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔ دریائے فرات عبور کیا اور دریا کا پل توڑ ڈالا تاکہ فرار کی راہ مسدود ہو جائے۔ مسلمانوں کا ایرانی فوج سے ٹکراؤ ہوا تو انہیں ایک بہت بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایرانی ہاتھیوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔ مسلمانوں کے گھوڑوں نے ایسی عجیب الخلقت چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لہٰذا

بدکنے لگے ۔ یہ صورت حال ہوئی تو ابو عبید گھوڑے سے اتر آئے اور ساتھیوں کو بھی یہی حکم دیا۔ پیادہ پا مسلمانوں نے ہاتھیوں پر رکھے ہوئے ہودوں کی رسیاں کاٹنا شروع کر دیں تو فیل نشین گرنے لگے۔ مگر ہاتھیوں نے مسلمان سپاہیوں کو روندنا شروع کر دیا۔ ان ہاتھیوں کے آگے ایک عظیم الجثہ سفید ہاتھی تھا وہ ابو عبید پر جھپٹا تو آپ نے اس کی سونڈ پر تیر چلایا تلوار سے اس کی سونڈ کاٹ دی تو اس نے غضب ناک ہو کر ابو عبید کو روند ڈالا اور اس طرح سے بہت سے مسلمانوں کی جانیں گئیں۔ مسلمان ہاتھیوں سے مقابلے کی سکت نہ پاکر بے تحاشا بھاگے، کچھ لوگ دریائے فرات میں کود پڑے اور ڈوب گئے۔ غرض کہ لشکر کا زیادہ تر حصہ لقمۂ اجل بن گیا باقی جو بچے شرمساری کی حالت میں مدینہ پہنچے۔

اس شکست کا حضرت عمر کو بہت صدمہ ہوا۔ آپ نے نئے سرے سے بڑے زور و شور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ دوسری طرف مثنیٰ نے عراق کے سرحدی مقامات سے ایک بڑی فوج جمع کر لی تھی۔ مسلمانوں کی اس فوج میں عرب قومیت رکھنے والے بعض عیسائی سردار بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس فوج کی مڈ بھیڑ ایرانیوں کے ساتھ رمضان ۱۴ھ میں ہوئی۔ مثنیٰ کی ثابت قدمی کی وجہ سے یہ جنگ شکست کے قریب پہنچ کر فتح میں تبدیل ہو گئی۔ ایرانی بھاگ کھڑے ہوئے مگر ان کا راستہ روک لیا گیا اور بے دریغ قتل کیا گیا اس معرکے کے بعد مسلمان سارے عراق میں پھیل گئے۔

مثنیٰ نے ایک بہت بڑے بازار کو بھی نشانہ بنایا۔ دوکاندار سامان چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگے۔ بے شمار نقدی اور مال و اسباب مثنیٰ کے ہاتھ لگا۔ یہ خبریں ایران کے پایۂ تخت پہنچیں تو انہیں اپنی خامیوں کا

احساس ہوا۔ پوران دخت کو تخت سے اتار کر یزدگرد کو جس کی عمر صرف سولہ برس تھی۔ تخت پر بیٹھا دیا گیا۔ یزدگرد کی تخت نشینی کے ساتھ سلطنت میں نئے سرے سے جان آگئی۔ اس صورت حال نے عراق کے ان لوگوں کو بغاوت کا حوصلہ بخشا کہ جن کے علاقوں پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ چنانچہ تمام مفتوحہ علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

اس صورت حال کا حضرت عمر پر شدید اثر ہوا۔ آپ نے فوجیں جمع کرنے کے لئے ہر طرف آدمی دوڑائے تو قبائل عرب ہزاروں کی ٹکڑیوں میں آکر جمع ہو گئے۔ حضرت عمر نے خود سپہ سالار لشکر کی حیثیت سے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مگر بعض بڑے صحابہ خصوصاً حضرت علی ابن ابی طالب کے مشورے سے رک گئے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس اہم مہم کی قیادت کون کرے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے یہ مشکل بھی حل کر دی۔ آپ نے مشہور صحابی سعد بن ابی وقاص کا نام تجویز کیا۔ حضرت عمر نے منظور کر لیا اور انہیں خاص ہدایتیں دے کر رخصت کیا۔ عراق کے سفر کی منزلیں بھی خود ہی متعین کیں۔ ان سے کہا کہ جہاں قیام کرنا وہاں کے مفصل حالات بھیجنا اور بغیر میری ہدایت کے آگے نہ بڑھنا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے حسب ہدایت قادسیہ کے مقام پر پہنچے اور پڑاؤ ڈالا۔ حضرت عمر کو حالات سے باخبر کیا۔ حضرت عمر کی ہدایت آئی کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے چند سفیر بھیجے جائیں کہ وہ انہیں اسلام کی طرف بلائیں۔ چنانچہ سعد نے چند لوگ ایران کے پایۂ تخت مدائن بھیجے۔ پہلے کچھ اسلام کی بات کی گئی۔ پھر اپنا اصول بتایا گیا کہ ہم دوسرے ملکوں میں جا کر لوگوں کو مسلمان بناتے ہیں۔ ورنہ جزیہ لیتے ہیں اور جزیہ بھی نہ ملے تو جنگ کرتے ہیں۔ نتیجتاً

طویل پڑاؤ کے بعد شدید جنگ شروع ہوئی اور کئی معرکے ہوئے اور جب ایرانی سپہ سالار رستم قتل ہوگیا تو ایرانیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ مسلمان فاتحانہ شان سے ایران کے پایۂ تخت مدائن میں داخل ہوئے یہ جنگ محرم ۱۴ھ میں لڑی گئی۔

عام طور سے جب سعد بن ابی وقاص کا نام لیا جاتا ہے۔ تو فاتح قادسیہ بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ سعد نے قادسیہ میں تلوار ہی نہیں چلائی بلکہ اپنے بالاخانہ پر بیٹھ کر فوج کی کمان کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں مولانا شبلی نعمانی کی دلچسپ تحریر ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں۔

"سعد جس وقت بیٹھے بالاخانہ پر فوج کو لڑا رہے تھے۔ ان کی بیوی بھی ان کے برابر بیٹھی تھی۔ ایرانیوں نے جب ہاتھیوں کو ریلا اور مسلمان پیچھے ہٹے تو سعد غصہ کے مارے بے تاب ہوتے جاتے تھے اور بار بار کروٹیں بدلتے تھے۔ سلمٰی یہ دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھی کہ افسوس آج مثنیٰ نہ ہوا۔ سعد نے اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا کہ مثنیٰ ہوتا تو کیا کر لیتا۔ سلمٰی نے کہا۔ سبحان اللہ بزدلی کے ساتھ غیرت بھی" اس بات پر طعن تھا کہ سعد خود لڑائی میں شریک نہ تھے۔"

(الفاروق)

اسی کتاب کی ایک اور تحریر ملاحظہ ہو۔

قادسیہ میں ایک قدیم شاہی محل تھا۔ جو عین میدان کے کنارے پر واقع تھا۔ سعد کو چونکہ عرق النساء کی شکایت تھی اور چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ اس لئے فوج کے ساتھ شریک نہ ہوسکے۔ بالاخانہ پر میدان کی طرف رخ کرکے تکیئے کے سہارے سے بیٹھے اور خالد بن عرفطہ کو اپنے بجائے سپہ سالار مقرر کیا۔ تاہم فوج کو لڑاتے خود تھے۔ یعنی جو

حکم دینا مناسب ہوتا تھا۔ پرچوں پر لکھوا کر اور گولیاں بنوا کر خالد کی طرف پھینکتے جاتے تھے۔ خالد انہیں ہدایتوں کے موافق موقع بموقع لڑائی کا اسلوب بدلتے جاتے تھے۔ (الفاروق ۱۱۸)

سوال یہ ہے کہ کیا سعد کی بیوی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ عرق النسا کی وجہ سے جنگ میں شریک نہیں ہوئے اور اگر معلوم تھا تو پھر جنگ میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے انہیں بزدل کیوں کہا۔؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ شوہر ایک موذی مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جہاد سے محروم ہو اور بیوی بزدلی کا طعنہ دے اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ شوہر عرق النساء جیسی تکلیف میں مبتلا ہو اور بیوی کو علم نہ ہو۔ سعد بن ابی وقاص کے جنگ میں شریک نہ ہونے کا عام فوجیوں نے بھی برا مانا۔ شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ اس فتح میں چونکہ سعد شریک جنگ نہ تھے۔ فوج کو ان کی طرف سے بدگمانی رہی، یہاں تک کہ شاعر نے کہا۔

وقاتلت حتیٰ انزل اللہ نصرہ ۂ میں برابر لڑا گیا یہاں تک کہ خدا نے برابر اپنی مدد بھیجی۔

وسعد بباب القادسیہ معتصم ، لیکن سعد قادسیہ کے دروازے ہی سے لپٹے رہے۔

فانیا وقدامت نساء کثیرہ ، ہم واپس پھرے تو سینکڑوں عورتیں بیوہ ہو چکی تھیں۔

ونسوۃ سعد لیس فیھن ایمہ ، لیکن سعد کی کوئی بیوی بیوہ نہیں ہوئی۔

یہ اشعار اسی وقت بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ گئے۔ یہاں تک کہ سعد نے تمام فوج کو جمع کر کے آبلوں کے زخم دکھائے اور اپنی معذوری

ثابت کی۔

(الفاروق، ناشر محمد دین اینڈ سنز لاہور ص ۱۳۰)

عرب تو زخموں سے چور چور ہونے کے باوجود بڑے جوش وخروش سے لڑتے تھے۔ تھوڑے سے آبلوں کی کیا اہمیت۔ بات یہی سمجھ میں آتی ہے کہ سعد سے وہ شجاعت ظاہر نہیں ہوئی کہ جو اتنے بڑے لشکر اور ایسی اہم جنگ کے سپہ سالار کو دکھانا چاہی تھی۔ بیماری کے باوجود دادِ شجاعت دینے کی کافی گنجائش رہی ہوگی۔ تبھی تو سعد کی بیوی نے انہیں بزدلی کا طعنہ دیا۔ بہرحال حقیقت کچھ بھی ہو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ سعد بن ابی وقاص نے قادسیہ کی جنگ میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ انھیں فاتحِ قادسیہ بڑی دھوم دھام سے کہا جاتا ہے۔

یاد رہے کہ یہ وہی سعد بن ابی وقاص ہیں کہ جن کا بیٹا عمر سعد میدانِ کربلا میں یزیدی فوج کا سالار تھا.... سُنّی مسلمان ان کا شمار عشرۂ مبشرہ میں کرتے ہیں، لیکن یہ صاحب عم زادِ رسولؐ جناب علی ابن ابیطالبؑ سے کینہ رکھتے تھے۔ اور عمر سعد اسی ماحول میں پل کر جوان ہوا تھا۔ چنانچہ نواسۂ رسولؐ کی جاہ و جلالت کا اس پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اور اس نے محض دُنیاوی منفعت کی خاطر اپنے فوجیوں کو گواہ بنا کر نمازِ صبح کے وقت فوجِ حسینیؑ کی طرف پہلا تیر پھینکا۔ اور وقتِ عصر امام حسین علیہ السلام کے گلے پر جب چھُری پھیری جا رہی تھی تو یہ کھڑا دیکھ رہا تھا۔

شاید ان بزرگ پر عشرۂ مبشرہ کا لیبل اس لئے لگایا گیا اور فتح قادسیہ کی دھوم اس لئے مچائی گئی کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس

حدیث کی زد سے بچایا جا سکے کہ منافق کی پہچان بغضِ علیؑ سے کیا کرو۔ نیز یہ کہ ان خطابات کی آڑ میں بیٹے کے گھناؤنے جرائم کی بھی پردہ پوشی کی جا سکے۔

بے پناہ دولت کا حصول

طبری کے مطابق "مدائن کی فتح کے وقت ہر مسلمان کے پاس سواری تھی۔ لہٰذا ہر ایک کو بارہ ہزار کی رقم ملی۔۔۔۔۔۔ سعد نے مدائن کے گھروں کو لوگوں میں تقسیم کر دیا۔۔۔۔۔۔ حضرت سعد نے خمس (غنیمت کا پانچواں حصہ) میں ہر قسم کے مال غنیمت کو شامل کر لیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عمر کسریٰ کے لباس، تلواریں اور زیورات دیکھ کر خوش ہو جائیں۔ خمس نکالنے کے بعد ایک بہت بڑا فرش باقی رہ گیا۔ اسے لوگوں کی رائے سے حضرت عمر کے پاس بھجوایا۔۔۔۔۔۔ اہل عجم نے اسے موسم سرما کے اس وقت کے لئے تیار کیا تھا۔ جب پھول پودوں کا خاتمہ ہو تا ہے۔ اس وقت جب وہ شراب نوشی کرتے تھے تو اس پر بیٹھ کر کرتے تھے تاکہ یہ فرش (ان کے لئے موسم بہار کے) باغات کا کام دے سکے۔ یہ ساٹھ مربع گز تھا۔ اس کی زمین سونے کی بنی ہوئی تھی اور اس کے نقش و نگار نگینوں کے تھے اور اس کے میوہ جات جواہرات کے تھے۔ اور اس کے پتے ریشم کے تھے۔ جس میں سونے کی آمیزش تھی۔ اہلِ عرب اسے قطف کہتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ جب یہ چیز حضرت عمر کے پاس مدینہ پہنچی۔۔۔۔۔۔ حمد و ثنا کے بعد مسلمانوں سے اس فرش کے بارے میں مشورہ طلب کیا۔۔۔۔۔۔ حضرت علی کے مشورے سے اسے کاٹ کر لوگوں میں تقسیم کرا دیا۔ حضرت علی کو اس کا جو ٹکڑا ملا تھا۔ اسے انہوں

بیس ہزار میں فروخت کر دیا۔ حالانکہ وہ بہترین ٹکڑوں میں سے نہیں تھا۔"

(تاریخ طبری جلد ۳ ——— ص ۳۳ تا ۳۵)

مولانا شبلی نعمانی غنیمت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کیانی سلسلہ سے لیکر نوشیرواں کے عہد کی ہزاروں یادگار چیزیں تھیں، خاقان چین، راجہ داہر، قیصر روم، نعمان بن منذر بہرام چوبیں کی زرہیں اور تلواریں تھیں، کسریٰ ہرمز اور قباد کے خنجر تھے۔ نوشیرواں کا تاج زرنگار اور ملبوس شاہی تھا۔ سونے کا ایک گھوڑا تھا جس پر چاندی کا زین کسا ہوا تھا اور سینہ پر یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ چاندی کی ایک اونٹنی جس پر سونے کی پالان تھی اور مہار میں بیش قیمت موتی پروتے تھے۔ ناقہ سوار سر سے پاؤں تک جواہرات سے مرصع تھا۔ ...... محلم نام مدینہ میں ایک شخص تھا جو نہایت موزوں قامت و خوبصورت تھا۔ حضرت عمر نے حکم دیا کہ نوشیرواں کے ملبوسات اس کو لاکر پہنائے جائیں۔ یہ ملبوسات مختلف حالتوں کے تھے۔ سواری کا جدا جشن کا جدا، چنانچہ باری باری تمام ملبوسات محلم کو پہنائے گئے۔ جب ملبوسات خاص اور تاج زرنگار پہنا تو تماشائیوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اور دیر تک لوگ حیرت سے تکتے رہے۔ فرش کی نسبت لوگوں کی رائے تھی کہ تقسیم نہ کیا جائے۔ خود حضرت عمر کا بھی یہی منشاء تھا لیکن حضرت علی کے اصرار سے اس بہار پر بھی خزاں آئی۔ اور دولت نوشیروانی کے مرقع کے پُرزے اڑ گئے۔ (الفاروق)

حضرت عمر کا یہ ناٹک کھیلنا سنت تھا یا بدعت اور حضرت عمر کا فرش محفوظ رکھنے کا منشاء اسلامی تعلیمات کے خلاف تھا۔ یا موافق اس کا فیصلہ تو آج کل کے ماہرین "شرک و بدعت" بہتر

طور سے کر سکتے ہیں۔ مگر ہم تو صرف اتنا عرض کریں گے کہ اس مظاہرہ سے نو دولتیے عربوں کی صرف آنکھیں خیرہ نہیں ہوئی ہوں گی۔ بلکہ ان کے ذہنوں پر وہی اثرات مرتب ہوئے ہوں گے کہ جو اس زمانہ میں ملبوسات کے فیشن شو سے مرتب ہوتے ہیں۔ یعنی ترغیب و تحریص کے جذبات کی جلا۔

مدائن کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ایرانی جلولا میں جمع ہو کر قلعہ بند ہو گئے۔ سعد بن ابی وقاص کو اطلاع ملی تو حضرت عمرؓ سے ہدایت مانگی۔ حضرت عمرؓ کی ہدایت آئی تو ہدایت کے مطابق ہاشم بن عتبہ کی سرداری میں بارہ ہزار کا لشکر جلولا روانہ ہوا۔ ہاشم نے وہاں پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مہینوں محاصرہ رہا۔ ایرانی کبھی کبھی باہر نکل کر جنگ کرتے اور پھر اندر ہو جاتے۔ اس طرح سے بہت سے معرکے ہوتے اور پھر ایک فیصلہ کن معرکہ جس میں مسلمانوں نے ایرانیوں کو بے دریغ قتل کیا اور فتح سے ہمکنار ہوئے۔

یہ جنگ سنہ ۱۶ھ میں لڑی گئی۔ طبری کے بقول "مسلمانوں نے ان کا تعقب کیا۔ اللہ نے اس دن ان کے ایک لاکھ آدمی قتل کر دیئے اور پورا میدان جنگ نیز اس کے سامنے اور پیچھے کا حصہ لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔" (طبری صفحہ ۴)۔ اس جنگ میں بے پناہ دولت مسلمانوں کے ہاتھ لگی۔

جس زمانہ میں جلولا کی جنگ ہو رہی تھی یزگرد حلوان میں تھا۔ جب اسے جلولا کی شکست کی خبر ملی تو حلوان چھوڑ کر رے بھاگ گیا۔ مگر یہاں بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور اس قبضہ کے بعد عراقی فتوحات کا سلسلہ مکمل ہو گیا۔

لشکر کشی کے اسباب

عراق پر لشکر کشی کی ابتدا حضرت ابوبکر کے زمانہ میں ہوئی۔

مولانا شبلی نعمانی بیان فرماتے ہیں کہ:

عراق میں قبیلۂ وائل کے دو سرداروں مثنیٰ الشیبانی اور سوید عجلی نے تھوڑی جمعیت بہم پہنچا کر عراق کی سرحد حیرہ، وابلہ کی طرف غارت گری شروع کی یہ حضرت ابوبکر کی خلافت کا زمانہ تھا اور خالد سیف اللہ یمامہ اور دیگر قبائل عرب کی مہمات سے فارغ ہو چکے تھے مثنیٰ نے حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہو کر عراق پر حملہ کرنے کی اجازت حاصل کی۔ مثنیٰ اگرچہ خود اسلام لا چکے تھے، لیکن اس وقت تک ان کا تمام قبیلہ عیسائی یا بت پرست تھا۔ حضرت ابوبکر کی خدمت سے واپس آ کر انہوں نے اپنے قبیلہ کو اسلام کی ترغیب دی اور قبیلہ کا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ ان نومسلموں کا ایک بڑا گروہ لے کر عراق کا رخ کیا۔ حضرت ابوبکر نے خالد کو مدد کے واسطے بھیجا۔ خالد نے عراق کے تمام سرحدی مقامات فتح کر لئے .... ابوبکر نے ربیع الثانی ۱۳ھ مطابق ۶۳۴ء میں خالد کو حکم بھیجا کہ فوراً شام کو روانہ ہوں اور مثنیٰ کو اپنا جانشین کرتے جائیں، خالد ادھر روانہ ہوئے اور عراق کی فتوحات دفعتہً رک گئیں۔

حضرت عمر تخت پر بیٹھے تو سب سے پہلے عراق کی مہم پر توجہ کی .... حضرت عمر نے کئی دن تک وعظ کیا لیکن کچھ اثر نہ ہوا آخر

چوتھے دن ایسے جوش سے تقریر کی کہ حاضرین کے دل ہل گئے۔ مثنیٰ شیبانی نے اٹھ کر کہا۔ مسلمانوں میں نے مجوسیوں کو آزمایا ہے وہ مردِ میدان نہیں ہیں عراق کے بڑے بڑے اضلاع کو ہم نے فتح کر لیا اور عجم ہمارا لوہا مان گئے ہیں۔ حاضرین میں ابو عبید ثقفی بھی تھے۔ جو قبیلہ ثقیف کے مشہور سردار تھے وہ جوش میں آکر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا افالھذا یعنی اس کام کے لئے میں ہوں۔ .... ابو عبید کو سپہ سالار مقرر کیا۔

(الفاروق)

معلوم ہوا کہ عراق پر فوج کشی کی کوئی شرعی وجہ نہیں تھی۔ اسلام میں کسی ملک پر فوج کشی صرف اسی وقت جائز ہے کہ جب وہ شرعاً فرض ہو اور شرعاً فرض ہونے کا مطلب یہ کہ وہ "جہاد" ہے یعنی عبادت ہے اور اگر اس کے سوا اور کچھ ہے تو وہ محض خونریزی ہے ہلاکت ہے، اور مالِ غنیمت، لوٹ کے مال کی طرح ہے۔

ذرا غور فرمایئے کہ حضرت ابوبکر کے دور خلافت میں قبیلہ وائل کے دو افراد مثنیٰ شیبانی اور سوید عجلی عراق کی سرحدوں پر غارت گری شروع کرتے ہیں اور پھر حضرت ابوبکر سے آکر عراق پر باقاعدہ حملہ کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اجازت مل جاتی ہے اور خالد بن ولید (کہ جو مرتدین اور مانعین زکوٰۃ کی جنگوں سے فراغت پا چکے ہوتے ہیں) کو مثنیٰ کی مدد کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مثنیٰ کو غارت گری کے جرم میں سزا ملتی کہ یہ اسلام میں بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ پھر ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کا جواب بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ خلیفۂ وقت کو عام دنیاوی حکمرانوں کی طرح سے اپنے ہم وطنوں کے مفادات عزیز تھے اور سیاسی مصلحتیں بھی تھیں۔ مسلمان لشکر

یمامہ اور دیگر قبائل عرب کی جنگوں سے فارغ ہو چکے تھے آخر انہیں بھی تو مصروف رکھنا تھا۔

پھر حضرت عمر کا دور آیا تو انہوں نے اپنے پیش رو خلیفہ کی جنگی پالیسی کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ بڑی شدت اختیار کی۔ اپنی خلافت کے پہلے ہی دن سے یہ فکر لگ گئی کہ کسی صورت عراق پر فوج کشی کا سلسلہ پھر شروع ہو جائے کہ جو خالد بن ولید کے شام چلے جانے کی وجہ سے رک گیا تھا۔ آخر کار چار دن کی ولولہ انگیز کوششیں رنگ لائیں اور عراق پر ایسی فوج کشی ہوئی کہ لاکھوں انسانی جانیں تلف ہوئیں، ہزاروں لونڈی غلام ہاتھ آئے، بے پناہ دولت ملی۔ خلافت کے حدود سلطنت میں ہزاروں مربع میل کا اضافہ ہوا۔

حضرت عمر کے دور میں کوئی نئی صورت حال نہیں پیدا ہو گئی تھی کہ کسی طور "جہاد" کا جواز پیدا ہوتا۔ بلکہ وہی اپنے پیش رو کے جذبات تھے کہ جس کے سبب یہ سب کچھ کیا گیا۔ حضرت ابوبکر نے جس کام کی ابتدا کی تھی اس کی انتہا مدائن کی فتح پر ہو گئی کہ یہ عراقی فتوحات کے سلسلہ کا آخری شہر تھا۔ بے پناہ دولت اور اتنے وسیع علاقہ کے ہاتھ میں آجانے کے بعد حضرت عمر گھبرا گئے۔ آپ کے منہ سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ "میں چاہتا ہوں کہ ہمارے اور ان کے (ایران کے) درمیان آگ کا ایک پہاڑ ہوتا" اور ایک اور موقع پر فرمایا۔ میں چاہتا تھا کہ ہمارے اور ایرانیوں کے بیچ میں آگ کے دریا حائل ہو جائیں۔" حضرت عمرؓ کی یہ خواہش تو بہر حال پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ کوفہ و بصرہ کے نئے شہر فوجی چھاؤنیوں کی صورت میں بسائے جا چکے تھے۔ اب حضرت عمر نہ چاہتے ہوئے بھی۔ ایران کے اندر گھس کر لشکر کشی کرنے کے لئے مجبور تھے۔ کیونکہ جس

جذبہ کے تحت یہ مہمات شروع کی گئیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا۔ ڈاکٹر طہٰ حسین (مصری) نے بڑی صحیح صورت حال پیش کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"اب مسلمانوں کو اس امر کا احساس ہو چلا تھا کہ جب تک ایرانیوں کے سر پر ان کا بادشاہ موجود ہے جو ان کی شیرازہ بندی کرتا رہے گا اور انہیں جنگ پر اکساتا رہے گا اس وقت تک مسلمان ایران کی عظمت و شوکت کو کم نہ کر سکیں گے اور جیسا کہ چاہیئے ان کی قوت کو نہیں تباہ کر سکیں گے۔ ادھر کوفہ اور بصرہ کی چھاؤنیوں میں اسلامی قلمرو کو وسعت دینے اور قریب کی ایرانی سرزمین پر غلبہ پانے کی زبردست خواہش موجود تھی۔

اب تک کوفہ نے ایرانی مملکت کے بعض حصوں کو فتح کرنے میں بصرہ کے مقابلے میں زیادہ کارگزاری کی تھی۔ چنانچہ بصرہ میں اس خواہش کا زور کرنا قدرتی تھا کہ ان کی فتوحات کا بھی دائرہ وسیع ہو، تاکہ وہ بھی بکثرت مال غنیمت سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ یوں بھی اہل بصرہ کے سامنے جہاد کی فضیلت تھی۔ حد یہ ہوئی کہ ایک دن احنف بن قیس نے حضرت عمرؓ سے کہہ دیا کہ اہل کوفہ کے مقابلے میں ہماری زندگیاں قدرے تنگی میں بسر ہوتی ہیں اور جب تک ہم ایران کو بالکل ہی فتح نہ کر لیں گے ہم ان سے محفوظ نہ رہ پائیں گے، یہ بات اس وقت کہی گئی جب احنف ایک وفد کے ساتھ بصرہ سے آئے تھے۔ کوفہ اور بصرہ دونوں حضرت عمرؓ سے مستقل اصرار کرتے رہے اور ان پر زور دیتے رہے کہ مسلمان لشکروں کو ایران کے اندر گھس جانے کی اجازت دے دیں اور آخرکار دربار خلافت سے انہیں یہ اذن مل ہی گیا۔ پہلے اہل بصرہ نکلے جنہوں نے شاہ ایران کا پیچھا کرنا شروع کیا اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں اور دوسرے شہر سے تیسرے شہر میں اس کا تعاقب شروع کیا۔ یہاں تک کہ اسے خراسان تک سے

نکل جانے پر مجبور کیا۔ بادشاہ نے تنگ آکر ایک دریا پار کیا اور ترکوں کے یہاں پناہ گزیں ہو گیا۔

اب ایران کے بادشاہ نے ترکوں کے بادشاہ سے اپنے وطن سے مسلمانوں کو نکالنے کے سلسلے میں مدد چاہی۔ ترک بادشاہ نے یہ درخواست قبول کر لی اور مدد کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن مسلمانوں نے اس موقع پر بھی اسی عزم و ثبات کا مظاہرہ کیا۔ جیسا انہوں نے اس سے پہلے ایرانیوں کے مقابلے میں کیا تھا۔ مسلمانوں نے ترکوں کا پیچھا اس وقت تک کرتے رہنا لازم سمجھا جب تک ان کو ان کے دیس واپس جانے پر مجبور نہ کر دیا چنانچہ اس دس سال اور چند ماہ کی تھوڑی سی مدت میں حضرت عمرؓ نے کسروی مملکت کو مکمل طور پر فتح کر لیا۔

(اردو ترجمہ "الشیخان" ناشر نفیس اکیڈمی ص ۱۶۱ تا ۱۶۲)

فتوحاتِ شام

شام کی فتوحات کی ابتداء بھی حضرت ابو بکرؓ کے دور خلافت میں ہو چکی تھی۔ آپ نے ۱۳ھ میں شام پر چار طرف سے حملہ کیا۔ ابو عبیدہ کو حمص، یزید بن ابو سفیان کو دمشق، شرجیل کو اردن اور عمرو بن العاص کو فلسطین پر مامور کیا۔ مگر یہ معلوم ہو جانے کے بعد کے قیصر روم نے ان تمام افسروں کے مقابلہ کے لئے الگ الگ فوجیں روانہ کر دی ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی فوجوں کو یکجا کرنے کی تجویز پر عمل کیا۔ ادھر خالد بن ولید بھی عراق سے دمشق پہنچ گئے۔

مسلمانوں نے دمشق کا زبردست محاصرہ کیا۔ محاصرہ نے بڑا طول

کھینچا۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ رحلت فرما گئے۔ ان کی جگہ حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے یہاں بھی حضرت ابوبکرؓ کی جنگی پالیسی کو جاری رکھا مگر خالد بن ولید کو معزول کر کے ان کی جگہ ابوعبیدہ بن الجراح کو شام کی افواج کا سپہ سالار بنا دیا۔ خالد بن ولید ابوعبیدہ کے ماتحت پورے جوش و خروش سے شریک رہے۔ روایات کے مطابق ابوعبیدہ نے خالد کو ان کی معزولی کا پروانہ اس وقت تک نہیں دکھایا کہ جب تک دمشق فتح نہ ہو گیا۔ اور دمشق رجب ۱۴ھ میں فتح ہوا۔ دمشق کی فتح کے بعد مسلمان اردن کی طرف روانہ ہوئے۔ رومی فوجیں دمشق کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے اردن کے شہر بیسان میں جمع ہوئیں۔ مسلمانوں نے بھی ان کے مدمقابل فحل کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ چنانچہ یہ جنگ اسی شہر کی مناسبت سے جنگ فحل کہلاتی ہے۔

مسلمان بڑے صبر و استقلال کے ساتھ دشمن کے مقابلہ پر ڈٹے رہے۔ یہ تیور دیکھ کر عیسائی صلح کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے ابوعبیدہ کو صلح کا پیغام بھیجا اور اس غرض سے سفارت بھیجنے کی درخواست کی۔ چنانچہ ابوعبیدہ نے مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبل کو عیسائیوں کی طرف روانہ کیا۔۔۔۔ معاذ بن جبلؓ ایک شان بے نیازی سے رومی لشکرگاہ میں پہنچے۔ رومیوں نے حضرت معاذ سے دریافت کیا کہ تم لوگ یہاں کس غرض سے آئے ہوئے ہو۔

اب حضرت معاذ کا جواب مولانا شبلی نعمانی کی زبانی سنیئے۔

سب سے پہلے ہماری درخواست یہ ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھو، شراب پینا چھوڑ دو، سور کا گوشت نہ کھاؤ، اگر تم نے ایسا کیا تو ہم تمہارے بھائی ہیں۔ اگر اسلام لانا منظور

نہیں جزیہ دو، اس سے بھی انکار ہو تو آگے تلوار ہے۔..... رومیوں نے کہا اچھا ہم تم کو بلقا کا ضلع اور اردن کا وہ حصہ جو تمہاری زمین سے متصل ہے دیتے ہیں۔ تم یہ ملک چھوڑ کر فارس چلے جاؤ۔ معاذ نے انکار کیا اور اٹھ کر چلے آئے۔

(الفاروق)

اس کے بعد مسلمانوں نے کمریں کس لیں۔ شدید معرکے ہوتے پھر مسلمانوں کو فتح ہوئی اور اردن کا پورا علاقہ قبضہ میں آگیا۔ یہاں سے مسلمان حمس کی طرف گئے اور حمص اور قرب وجوار کے علاقہ فتح کر لئے تو ابو عبیدہ نے وہیں قیام کیا۔ خالد دمشق چلے گئے اور عمرو بن العاص نے اردن کا رخ کیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۴ھ وقوع پذیر ہوا۔

حمص کی شکست کے بعد رومیوں میں تہلکہ مچ گیا۔ قیصر روم پورے غیض وغضب کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے پایہ تخت انطاکیہ میں لاکھوں کا لشکر اکٹھا کر لیا۔ مسلمانوں کو اطلاع ہوئی تو ان پر خوف طاری ہونے لگا۔ چنانچہ مسلمان نے حمص کا علاقہ خالی کر دیا اور دمشق آگئے۔ حضرت عمرؓ کو جب یہ معلوم ہوا کہ مسلمان خوف زدہ ہو کر حمص سے چلے گئے تو بہت رنجیدہ ہوئے۔ اسی اثنار میں عمرو العاص نے ابو عبیدہ کو اردن کی صورت حال سے باخبر کیا کہ وہاں رومیوں کی آمد سے تہلکہ مچا ہوا ہے۔ چنانچہ ابو عبیدہ نے اردن پہنچ کر یرموک میں قیام کیا اور لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اُدھر رومیوں کا دو لاکھ سے زیادہ کا لشکر یرموک کے بالمقابل صف آرا ہوا۔ پہلے دن کے معرکہ کے بعد جنگ رکی۔ تو رومی سرداروں نے صلح کے لئے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور پھر ابو عبیدہ کے پاس قاصد بھیجا کہ صلح کی گفتگو کے لئے کسی معزز شخص کو بھیجا جائے۔

چنانچہ ابو عبیدہ نے اس غرض سے خالد بن ولید کو روانہ کیا۔ خالد نے حسب معمول تین باتیں پیش کیں۔ اسلام قبول کرو، جزیہ دو یا پھر جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ رومی نہ تو اسلام قبول کرنے پر تیار ہوئے اور نہ ہی جزیہ دینے پر لہٰذا معاملہ طے نہ ہو سکا اور خالد واپس آگئے۔ پھر مسلمانوں اور رومیوں میں زبردست معرکے ہوئے۔ مسلمان جان توڑ کر لڑے۔ شروع شروع میں تو رومیوں کا پلہ بھاری رہا۔ مگر آخر کار رومیوں کو شکست ہوئی۔

بعض روایتوں کے مطابق ایک لاکھ اور بعض کے مطابق ستر ہزار رومی مارے گئے۔ تین ہزار مسلمان کام آئے۔ اسی جنگ میں ابوجہل کے فرزند عکرمہ بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔

یرموک کی جنگ کے بعد ۱۶ھ میں بیت المقدس میں محصور عیسائیوں نے صلح کی درخواست اس شرط کے ساتھ کی کہ صلح نامہ خود خلیفہ کے ہاتھ سے لکھا جائے۔ چنانچہ طبری کے مطابق رجب کے مہینے میں حضرت عمر حضرت علی کو اور یعقوبی کے مطابق حضرت عثمان کو اپنا نائب بنا کر مدینہ سے روانہ ہوئے۔ مولانا شبلی نعمانی الفاروق میں طبری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "سرداروں کو اطلاع دی جا چکی تھی۔ کہ جابیہ میں آکر ان سے ملیں اطلاع کے مطابق یزید بن ابی سفیان اور خالد بن ولید وغیرہ نے یہیں استقبال کیا۔ شام میں رہ کر ان افسروں میں عرب کی سادگی باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ حضرت عمر کے سامنے یہ لوگ آئے تو اس ہیئت سے آئے کہ بدن پر حریر اور دیبا کے حلّے اور پُر تکلف قبائیں تھیں اور زرق برق پوشاک اور ظاہری شان و شوکت سے عجمی معلوم ہوتے تھے حضرت عمر کو سخت غصہ آیا۔ گھوڑے سے اتر پڑے۔ سنگریزے اٹھا کر

ان کی طرف پھینکے کہ اس قدر جلد تم نے عجمی عادتیں اختیار کرلیں۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ قباؤں کے نیچے ہتھیار ہیں۔ (یعنی سپہ گری کا جوہر ہاتھ سے نہیں دیا) فرمایا کچھ مضائقہ نہیں............

ایک دن بلال (رسول اللہ کے موذن) نے آکر شکایت کی کہ امیرالمومنین ہمارے افسر پرند کا گوشت اور میدہ کی روٹیاں کھاتے ہیں لیکن عام مسلمانوں کو معمول کھانا بھی نصیب نہیں۔ حضرت عمر نے افسروں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ ملک میں تمام چیزیں ارزاں ہیں۔ جتنی قیمت میں حجاز میں روٹی اور کھجور ملتی ہے۔ یہاں اسی قیمت پر پرند کا گوشت اور میدہ ملتا ہے۔ حضرت عمر افسروں کو مجبور نہ کرسکے۔ لیکن حکم دیدیا کہ مال غنیمت اور تنخواہ کے علاوہ ہر سپاہی کا کھانا مقرر کردیا جائے

(الفاروق)

غرض کہ معاہدہ صلح لکھا گیا۔ جس پر بڑے بڑے صحابہ نے دستخط کئے۔

لشکر کشی کی وجوہات:

شام پر لشکر کشی کی وجوہات کا بھی کوئی پتہ نہیں چلتا۔ کسی تاریخ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کی لشکر کشی سے پہلے رومیوں کے حملہ یا حملہ کی تیاریوں کی کوئی اطلاع آئی ہو یا یہ کہ خود اہل شام نے رومیوں کے مظالم سے تنگ آکر مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ آکر انہیں ظلم سے نجات دلائیں۔ ہاں اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ انہی رومیوں سے جنگ موتہ ہوئی تھی۔ جس میں حضرت جعفر طیار اور زید بن حارثہ شہید ہوئے۔ اور جب خالد بن ولید نے لشکر کی سپہ سالاری

سنبھالی تو فوجوں کو ساتھ خیریت کے مدینہ لے آئے۔ دوسرا واقعہ خود رسول اللہ کا لشکر لے کر رومیوں کے مقابلہ پر تبوک جانے کا ہے۔ رسول اللہ کو اطلاع ملی تھی کہ رومی لشکر زبردست تیاری کے ساتھ حملہ آور ہونے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔ مگر یہ خبر غلط نکلی تو آنحضرت خاموشی سے واپس چلے آئے۔ شام کے علاقہ میں فتوحات نہیں کیں۔ مگر اب کیا سبب ہوا کہ حضرت ابوبکر نے ایک ساتھ حمص، دمشق، اردن اور فلسطین پر لشکر کشی کر دی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بھی وہی اسباب ہیں کہ جو عراق کی لشکر کشی کے سلسلے میں بیان کئے جا چکے ہیں۔

شام کی فوجی مہمات کے دوران ایسے مواقع بھی آئے کہ صلح ہو سکتی تھی۔ جنگ فحل کے موقع پر رومیوں نے بلقا کے علاقہ اور اردن کے اس حصہ کو کہ جو مسلمانوں کی سرحد سے متصل تھا۔ مسلمانوں کے حوالے کرنے کی پیش کش کی تھی تاکہ وہ جنگ نہ کریں اور واپس چلے جائیں۔ مگر مسلمان جزیہ سے کم پر صلح کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

سوائے بیت المقدس کے شام کے سارے علاقے زبردست خونریزی کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ کیونکہ یہ خونریزی مذہب کے نام پر ہوئی تھی۔ لہذا اسے مستحسن خیال کیا جاتا ہے اور ہمارے روشن ماضی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

مصر کی فتح:

عمرو بن العاص نے سنہ ۲۰ھ میں حضرت عمرؓ کی اجازت سے مصر پر چڑھائی کی۔ آپ چار ہزار کا لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ چھوٹی چھوٹی فتوحات کرتے ہوئے دریائے نیل کے کنارے ایک مقام پر پہنچے۔ جس کا نام بعد

میں فسطاط پڑا۔ یہ ایک چراگاہ تھی اور یہاں ایک قلعہ تھا جس میں رومی حکام رہا کرتے تھے۔ عمرو نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ مقوقس بادشاہِ مصر کہ جو قیصرِ روم کا باجگذار تھا، بھی اس قلعہ میں موجود تھا۔ قلعہ بہت مضبوط تھا۔ چنانچہ عمرو بن العاص نے حضرت عمرؓ سے کمک کی درخواست کی۔ انہوں نے دس ہزار فوج روانہ کر دی۔ جس میں حضرتِ زبیر بن العوام بھی تھے۔

عمرو بن العاص جو کہ اپنی چالاکی کے لیے مشہور تھے۔ بہادر کم اور چالاک زیادہ تھے، فوراً زبیر بن العوام کو آگے کر دیا کہ محاصرہ کا انتظام آپ ہی سنبھالیے مگر مولانا شبلی نے عمرو بن العاص کی اس چالاکی کو حسنِ عقیدت سے تعبیر کیا، فرماتے ہیں کہ "زبیر کا جو رتبہ تھا۔ اس کے لحاظ سے عمرو نے ان کو افسر بنایا اور محاصرہ وغیرہ کے انتظامات ان کے ہاتھ میں دے دیئے۔" (الفاروق)

تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ایسے مواقع پر بہادر کسی کے رتبہ کا خیال نہیں رکھتے تھے اور فتح کا اعزاز خود حاصل کرنا چاہتے تھے اور یہاں یہ سخاوت کہ خلیفہ کی طرف سے امیرِ لشکر خود ہیں اور اپنی موجودگی میں افسر دوسرے کو بنا رہے ہیں اور محاصرہ کی ساری ذمہ داریاں سونپ رہے ہیں۔

بہرحال زبیر نے بھی بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ ثابت ہو گیا کہ عمرو اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ پورے سات مہینے گذر گئے اور فتح و شکست کا کچھ فیصلہ نہ ہوا۔ زبیر نے ایک دن تنگ آ کر کہا کہ آج مسلمانوں پر فدا ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر ننگی تلوار ہاتھ میں لی اور سیڑھی لگا کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے۔

چند اور صحابہ نے ان کا ساتھ دیا۔ فصیل پر پہنچ کر سب نے ایک ساتھ تکبیر کے نعرے بلند کئے۔ ساتھ ہی تمام فوج نے نعرہ مارا کہ قلعہ کی زمین ہل گئی، عیسائی یہ سمجھ کر کہ مسلمان قلعہ کے اندر گھس آئے بدحواس ہو کر بھاگے ادھر زبیر نے فصیل سے اتر کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور تمام فوج اندر گھس گئی۔ مقوقس نے یہ دیکھ کر صلح کی درخواست کی اور اسی وقت سب کو امان دے دی گئی۔ (الفاروق)

فسطاط کی فتح کے بعد عمرو بن العاص نے ۲۱ھ میں حضرت عمر کی اجازت سے اسکندریہ کا رخ کیا۔ راستہ میں رومیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اسکندریہ پہنچے۔ مقوس مسلمانوں سے لڑنا نہیں چاہتا تھا اور جزیہ دینے پر آمادہ تھا۔ مگر رومیوں کے خوف سے مجبور تھا، چنانچہ در پردہ مسلمانوں سے مل گیا اور قبطی خفیہ طور پر مسلمانوں کی مدد کرنے لگے۔ رومی قلعہ بند ہو کر لڑتے رہے۔

جب محاصرہ نے بہت طول کھینچا تو حضرت عمر کی طرف سے ڈانٹ پھٹکار کا ایک خط آیا اور اس میں عمرو العاص کو حکم دیا گیا تھا کہ تمام فوج کو جمع کر کے جہاد پر خطبہ دو اور پھر تمام فوج دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ "عمرو نے تمام فوج کو یکجا کر کے خطبہ پڑھا اور ایک پُراثر تقریر کی کہ سب ہوئے جوش تازہ ہو گئے۔ عبادہ بن صامت کو جو برسوں رسول اللہ کی صحبت میں رہے تھے بلا کر کہا کہ اپنا نیزہ مجھ کو دیجئے۔ خود سر سے عمامہ اتارا اور نیزے پر لگا کر ان کو حوالہ کیا کہ یہ سپہ سالار کا علم ہے اور آج آپ سپہ سالار ہیں، زبیر بن عوام اور مسلمہ بن مخلد کو فوج کا ہراول کیا، غرض اس سرو سامان سے قلعہ پر دھاوا ہوا اور پہلے ہی حملہ میں شہر فتح ہو گیا۔ (الفاروق)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں بھی عمرو بن العاص نے عیّاری اور فنکاری دکھائی۔ اپنے عمامہ کو عبادہ بن صامت کے نیزے پر سجا کر کہا کہ یہ لیجئے علم اور اب آپ بن گئے سپہ سالار، اور پھر زبیر اور مسلمہ بن مخلد کو بھی آگے کر دیا اور خود کہاں رہے یہ معلوم نہیں ہو سکا۔

اسکندریہ کی فتح کے بعد کوئی جگہ باقی نہیں رہی کہ جس کے فتح کرنے میں کوئی دقت پیش آتی۔ مگر پورے مصر میں رومی پھیلے ہوئے تھے لہذا عمرو بن العاص نے ہر طرف تھوڑی تھوڑی فوجیں بھیجیں۔ چنانچہ مصر کا پورا علاقہ قابو میں آگیا۔ بہت سے قبطیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور جو اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے انہوں نے جزیہ دینا پسند کیا۔

مصر پر لشکر کشی کیوں کی گئی.؟

"مصر کی فتح اگرچہ فاروقی کارناموں میں داخل ہے۔ لیکن اس کے بانی مبانی عمرو بن العاص تھے۔ وہ اسلام سے پہلے تجارت کا پیشہ کرتے تھے اور مصران کی تجارت کی جولانگاہ تھا۔ اس زمانہ میں مصر کی نسبت اس قسم کا خیال بھی ان کے دل میں نہ گذرا ہوگا۔ لیکن اس کی زرخیزی اور شادابی کی تصویر ان کی نظر میں پھرتی رہتی تھی۔ حضرت عمر نے شام کا جو اخیر سفر کیا اس میں یہ ان سے ملے اور مصر کی نسبت گفتگو کی، حضرت عمر نے پہلے احتیاط کے لحاظ سے انکار کیا۔ لیکن آخر اس کے اصرار پر راضی ہو گئے۔ اور چار ہزار فوج ساتھ کر دی اس پر بھی ان کا دل مطمئن نہ تھا عمرو سے کہا۔ خدا کا نام لے کر روانہ ہو، لیکن مصر پہنچنے سے پہلے اگر میرا خط پہنچ جائے۔ تو الٹے پھر آنا۔ عرلیش پہنچے تھے کہ حضرت عمر کا خط پہنچا۔ اگرچہ اس میں آگے بڑھنے سے روکا تھا۔ لیکن چونکہ شرطیہ حکم

تھا۔ عمروؓ نے کہا اب تو ہم مصر کی حد میں آچکے ہیں۔ غرض عریش سے چل کر فرما پہنچے۔

(الفاروق)

شبلی نعمانی صہ۲۲۸ کے حاشیہ پر مقریزی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

قاصد مقام فج میں عمروؓ سے ملا۔ انہوں نے اس خیال سے کہ آگے بڑھنے سے منع کیا ہوگا۔ قاصد سے خط نہیں لیا۔ اور کہا کہ جلدی کیا ہے منزل پر پہنچ کر لے لوں گا۔ عریش کے قریب پہنچے تو خط لیکر کھولا اور پڑھ کر کہا امیر المومنین نے لکھا ہے مصر نہ پہنچ چکے ہو تو رک جانا۔ لیکن ہم تو مصر کی سرحد میں آچکے ہیں۔

مصر پر لشکر کشی کے عدم جواز کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں کہنا ہے۔ کیونکہ مولانا شبلی نعمانی کی ایک ایک سطر صاف بتا رہی ہے کہ اس لشکر کشی کا دور دور کوئی جواز نہ تھا۔ اس کی وجہ محض عمرو بن العاص کی خواہش تھی کہ ان کی نظروں کے سامنے مصر کی زرخیزی تھی اور وہ اس صوبہ کا حاکم بننا چاہتے تھے۔ عمروؓ کے سبز باغ دکھانے کے باوجود حضرت عمر مصر پر لشکر کشی کے لئے تیار نہ تھے۔ اجازت دینے کے بعد بھی مطمئن نہ ہوتے تو اس اجازت کو مشروط کر دیا اور پھر راستے سے پلٹ آنے کا حکم بھیج دیا۔ حضرت عمر کا یہ خوف اور بے یقینی کچھ عجیب و غریب سی لگتی ہے۔ اگر مصر پر لشکر کشی اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق تھی تو پھر خوف اور بے یقینی کیسی اور اگر ان کے احکام کے خلاف تھی تو ایک عمرو تو کیا ہزار عمرو ہوتے تو حضرت عمر کو سختی سے ڈانٹ دینا چاہیے تھا دراصل حضرت عمر کے اس خوف اور بے یقینی نے یہ بات ثابت کردی کہ اب تک کی ساری جنگیں کشور کشائی اور قوم کے مالی فائدے کے لئے کی گئیں تھیں۔

برسوں سے طویل جنگیں ہو رہی تھیں۔ لاکھوں مربع میل کا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا۔ دولت کے انبار لگ گئے تھے۔ ان جنگوں میں ہزاروں مسلمان کام آئے تھے۔ حضرت عمرؓ میں مزید حوصلہ نہ تھا۔ آپ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی نیا محاذ کھولیں اور نئے سرے سے قوم کو خطرات میں ڈالیں۔ مگر عمرو بن العاص کو اپنی صوبہ داری کے لئے پسندیدہ سرسبز علاقہ چاہیئے تھا لہذا انہوں نے خلیفہ رسول کو خونریزی پر راضی کر ہی لیا اور پھر جب خلیفہ نے گھبرا کر واپس آنے کا حکم بھیجا تو تعمیل نہیں کی۔ اور حیلہ یہ کیا کہ ہمیں تو یہ خط حدود مصر میں ملا ہے۔ حالانکہ قاصد ان حدود میں داخل ہونے سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ حضور خط لے لیجئے مگر عمرو کہتے تھے جلدی کیا ہے منزل پر جا کر لے لوں گا۔

وفاتِ حضرت عمرؓ

حضرت عمر کے قتل کا واقعہ اس طرح ہوا کہ ایک مرتبہ آپ کے پاس ایک ایرانی غلام جس کا نام فیروز اور کنیت ابولولو تھی۔ آیا اور اپنے آقا مغیرہ بن شعبہ کی شکایت کرنے لگا کہ وہ اس سے زیادہ ٹیکس لیتے ہیں۔ حضرت عمر نے اس کے کئی پیشوں (نجاری، نقاشی اور آہن گری) کو دیکھتے ہوئے فیصلہ اس کے خلاف دیا اور کہا کہ مغیرہ جو کچھ لیتے ہیں وہ جائز ہے چنانچہ ابولولو ناراض ہو کر چلا گیا۔ طبری کی ایک روایت کے مطابق حضرت عمر نے ابولولو سے کہا کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کہتے ہو کہ میں ایک ایسی چکی بنا سکتا ہوں جو ہوا کے زور سے آٹا پیس دے۔ اس نے کہا: "ہاں" آپ نے فرمایا تم میرے لئے ایسی چکی بنا دو۔ وہ بولا۔ اگر میں زندہ رہا تو میں آپ کے لیے ایسی چکی بناؤں گا۔ جس کا مشرق و مغرب میں چرچا رہے گا۔ (طبری)

دوسرے دن جب حضرت عمرؓ صبح کی نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے تو ابولولو نے خنجر کے پے در پے چھ وار کئے۔ آخری وار زیرِ ناف لگا اور یہی جان لیوا ثابت ہوا۔ پھر ابولولو وہاں سے بھاگا اور بھاگتے بھاگتے کئی آدمیوں کو زخمی کر گیا۔ پکڑا گیا تو دہی خنجر اپنے مار لیا اور جان دے دی۔

ہمیں اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ پر وار پر وار ہوتے رہے اور لوگ خاموش رہے۔ کم از کم اگلی صف کے لوگوں کو تو پہلے

دوسرے وار میں ہی پتہ چل گیا ہوگا. کیونکہ لوگ حالتِ قیام میں تھے. مگر انہوں نے قاتل کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی. اور خود حضرت عمر کہ جو بڑے لمبے تڑنگے انسان تھے اور قیام کی حالت میں تھے. وہ بھی وار پر وار کھاتے رہے. یہاں تک کہ چھ وار کھا لئے اور کوئی مزاحمت نہیں کی. یہ حالات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ قتل اس طرح نہیں ہوا کہ جس طرح بیان کیا جاتا ہے. دراصل عقیدت مند یہ چاہتے تھے کہ کیونکہ حضرت علی بن ابی طالب مسجد کوفہ میں نماز پڑھاتے ہوئے زخمی ہوئے. لہٰذا حضرت عمرؓ کو بھی نماز کی حالت میں مسجد میں زخمی ہونا چاہیئے تھے مگر وہ یہ بھول گئے کہ قاتل حضرت علی پر صرف ایک وار کر سکا اور وہ بھی سجدہ کی حالت میں، جو کہ ممکن ہے.

حضرت عمر کے قتل کی جو وجہ مورخ نے بتائی ہے وہ ظاہری اور فوری وجہ تو ہو سکتی ہے. مگر قتل کے اصل اسباب کچھ اور تھے اگر بات محض یہ تھی کہ ابولولو کا آقا ذرا زیادہ ٹیکس لیتا تھا تو غصہ میں آ کر اپنے آقا کو قتل کر دینا چاہیئے تھا نہ کہ خلیفہ وقت کو.

دراصل یہ اس سماج سے بغاوت تھی کہ جس میں فیروز ابولولو جی رہا تھا. مسئلہ صرف چند سکوں کا نہ تھا. بلکہ وہ غلامی کی اصل تلخی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ صرف وہی نہیں بلکہ اس کے ہزاروں ہم وطن غلامی کا طوق پہنے ہوئے ہیں اور آئے دن بات بات کہتے قتل کر دیئے جاتے ہیں.

بصرہ کے گورنر ابوموسیٰ اشعری حضرت عمر کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ مسلمان بوقت اشتعال فارسیوں پر حملہ کر کے انہیں قتل کر دیتے ہیں. ان کا خون بہا کتنا دلوایا جائے؟ عمر فاروق نے جواب دیا.

فارسی غلام ہیں، ان کے مقتول کا خون بہا ایک غلام کی قیمت کے برابر مقرر کردو۔ کنز العمال ۷/۳۰۴۔

(حضرت عمر کے سرکاری خطوط، ادارہ اسلامیات لاہور ص ۲۳۵)

اس وقت بصرہ میں غلام کی قیمت تین سو روپے (چھ سو درہم) تھی (عمرؓ کے سرکاری خطوط) ابولولو یقیناً اسی صورت حال سے بے خبر نہ ہوگا۔ اس کی قلبی کیفیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین الیشخان میں لکھتے ہیں کہ بعض روایات ہمیں بتاتی ہیں کہ یہ ایرانی غلام جب کبھی فارسی غلاموں کے بچوں کو دیکھتا تو ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتا اور کہتا کہ "عرب میرا جگر کھا گئے" (اردو ترجمہ الیشخان)

اور یہ اس کے جگر کی ٹیس تھی کہ جس نے اسے مجبور کردیا کہ وہ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر خلیفہ وقت کو قتل کر ڈالے کہ جو اس کے نزدیک اس تمام صورت حال کا ذمہ دار تھا۔

یہ قتل باقاعدہ ایک منصوبہ کے تحت ہوا اور اس میں کئی اور لوگ بھی شریک تھے۔ ہرمزان اور جفینہ جنہیں عبیداللہ بن عمر نے اشتعال میں آکر خود ہی قتل کر دیا تھا۔ کیونکہ ابولولو کے ساتھ صلاح مشورہ کرتے دیکھے گئے تھے۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر اس بات کے گواہ تھے کہ انہوں نے ابولولو اور ہرمزانؓ اور جفینہؑ کو کچھ صلاح مشورہ کرتے دیکھا تھا۔ اور عبدالرحمٰن کا یہ کہنا تھا کہ تینوں مجھے دیکھتے ہی وہاں سے ہٹ گئے۔ میں نے ان کے پاس ایک دو پھلوں والا خنجر بھی دیکھا تھا کہ

ع۱ ہرمزان کا شمار صف اول کے ایرانی امراء میں ہوتا تھا اور ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے مدینہ آیا تھا۔ اس نے حضرت عمر سے چال چل کر اپنی جان بخشی کرالی تھی۔

ع۲ یہ تھا تو عرب مگر عیسائی مذہب رکھتا تھا۔

جس کا قبضہ بیچ میں تھا۔ عبدالرحمٰن کے اس بیان کے بعد وہ خنجر دیکھا گیا تو ان کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔

اس سلسلہ میں ایک اور قابلِ ذکر نام کعب الاحبار کا ہے۔

یہ یمن کا یہودی تھا اور بعض روایتوں کے مطابق اس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور یہ وہ دور تھا کہ جب حضرت علی یمن کے قاضی تھے۔ کعب حضرت عمر کے زمانے میں مدینہ آیا تھا اور یہاں رسول اللہ کے چچا حضرت عباس کے پاس ایک غلام کی حیثیت سے رہتا تھا۔ یہ مسلمانوں سے جھوٹی سچی باتیں کر کے لطف لیتا پھرتا۔ اکثر لوگوں سے کہتا کہ میں نے تمہارا ذکر توریت میں پڑھا ہے۔ لوگ یہ باتیں سنتے تو حیرت کرتے اور خوش ہوتے۔ اس شخص نے حضرت عمر کو بھی نہیں بخشا۔ ایک دن ان سے کہنے لگا کہ آپ کا ذکر توریت میں موجود ہے۔ حضرت عمر نے حیرت کا اظہار کیا کہ توریت میں ان کا نام ہے تو فوراً بات بنا دی کہ نہیں۔ تمہاری صفات اور خوبیوں کا ذکر موجود ہے۔ ایک دن حضرت عمر سے کہنے لگا کہ آپ شہید مریں گے۔ آپ نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے میں تو بیچ عرب میں رہتا ہوں۔ جہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر وہ اصرار کرتا رہا تو حضرت عمر نے فرمایا کہ شہادت تو ہر اس جگہ مل سکتی ہے جہاں اللہ کی مرضی ہو۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کعب الاحبار کے بارے میں ایک بڑی دلچسپ روایت نقل کرتے ہیں۔ ایک روز عمر اپنی بیوی ام کلثوم[1] بنت علی کے یہاں تشریف

---

[1] : اس روایت کو کہ ام کلثوم بنت علی حضرت عمر کی بیوی تھیں، شیعہ معقول بنیادوں پر لغو سمجھتے ہیں۔ سنی المذہب ہونے کی وجہ سے طٰہٰ حسین کے نزدیک اس روایت کو قبول کر لینے میں کوئی تکلیف دہ بات نہیں تھی۔ غالباً انہوں نے تحقیق ضروری نہیں سمجھی۔

لے گئے۔ وہ رو رہی تھیں۔ حضرت عمر نے رونے کا سبب پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ یہودی ہے نا کعب الاحبار، وہ کہتا ہے تم آگ میں جاؤ گے! بعد میں جب حضرت عمر نے کعب کو دیکھا تو آپ نے اس سے اس باب میں سوال کیا تو کعب نے کہا نہیں۔ آپ تو جنت میں جائیں گے۔ امیرالمومنین بولے کیا خوب! ایک دفعہ جنت میں اور ایک دفعہ جہنم میں! کعب بولا۔ امیرالمومنین ذرا ٹھہریئے بخدا توریت میں آپ جہنم ہی میں دکھائے گئے ہیں، ان معنی میں کہ آپ جہنم کے دروازے پر کھڑے مسلمانوں کو اس میں گرنے سے روک رہے ہیں

اردو ترجمہ الشیخان (ص ۲۵۰ - ۲۵۱)

ابولولو کی اس دھمکی کے تذکرہ کے بعد کہ آپ کے لئے ایسی چکی بناؤں گا کہ جس کا چرچا مشرق و مغرب میں رہے گا۔ علامہ طبری کعب کی پیش گوئی کے عنوان سے یہ روایت لکھتے ہیں۔

جب دوسرا دن ہوا تو کعب الاحبار آپ کے پاس آکر کہنے لگے" اے امیرالمومنین میرا خیال ہے کہ آپ تین دن میں وفات پا جائیں گے۔ آپ نے پوچھا تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ وہ بولے: مجھے اللہ بزرگ و برتر کی کتاب توریت میں یہ بات نظر آئی۔ آپ نے فرمایا" کیا تمہیں عمر بن خطاب کا نام بھی توریت میں ملا ہے؟ وہ کہنے لگے۔ آپ کا نام تو نہیں ہے۔ لیکن آپ کا حلیہ اور صفت موجود ہے۔ اس بات کا پتہ چلا ہے کہ آپ کی زندگی ختم ہو گئی ہے۔

راوی کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں آپ کو کوئی بیماری اور تکلیف لاحق نہ تھی۔ دوسرے دن بھی کعب آئے اور کہنے لگے۔ آپ کا ایک دن گذر گیا اور دو دن باقی ہیں"۔ اگلے دن آکر وہ کہنے لگے" آپ کے دو دن گذر

گئے ہیں اور صرف ایک دن باقی رہ گیا ہے۔ اب آپ کی زندگی صبح تک ہے۔

(طبری جلد ۲، ——— صہ ۲۴۱-۲۴۲)

اور طبری میں ہے کہ اگلی صبح کو ابو لولو نے آپ کو چھ وار کر کے زخمی کیا۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو کعب بھی اس سازش میں شریک ہوگا یا کم از کم اسے اس بات کا علم تو ضرور ہوگا۔

طبری کی ہی ایک روایت کے مطابق حضرت عمر کے زخمی ہونے کے بعد جب کعب آئے تو حضرت عمر نے یہ شعر پڑھے۔

۱۔ کعب نے مجھے تین دن کے اندر (موت کی) خبر دی تھی۔ جسے میں شمار کرتا رہا۔ بلاشک وشبہ جو کچھ کعب نے کہا تھا وہ پورا ہو کر رہا۔

۲۔ مجھے موت کا خوف نہیں، کیونکہ موت لامحالہ آئے گی۔ مجھے پے درپے گناہوں کا خوف ہے۔

(طبری حصہ سوم ۲۴۴)

حضرت عمر کے ایمان و عادات کا تقاضہ تو یہ تھا کہ آپ کعب الاحبار کی ان پیشین گوئیوں پر اسے کوڑے مارتے کیونکہ اسلام میں اس قسم کی باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر حضرت عمر اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے رہے اور پھر وقت آخر کا یہ فقرہ کہ "بلاشک وشبہ جو کچھ کعب نے کہا تھا وہ پورا ہو کر رہا۔" بڑا حیرت انگیز ہے۔

ہمیں اس کے دو ہی سبب نظر آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ میں یہ عام انسانی کمزوری بھی موجود تھی کہ اگر تعریف کی جائے یا عظمت کا کوئی پہلو سامنے لایا جائے تو خوشی ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ آپ کو توریت سے کچھ معنی خیز دلچسپی بھی تھی۔ شاہ ولی اللہ نے دارمی کے

حوالے سے لکھا ہے کہ:

عن جابر ان عمر بن الخطاب آتی رسول اللہ بنسخۃ من التوراۃ فقال یا رسول اللہ ھذہ نسخۃ من التوراۃ فسکت فجعل یقراء وجہ رسول اللہ تیغیر فقال ابوبکر ثکلتک الثواکل ماتری بوجہ رسول اللہ فنظر عمر الی وجہ رسول اللہ فقال اعوذ باللہ من غضب اللہ و من غضب رسول اللہ۔ جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ عمرؓ توراۃ کا ایک نسخہ لئے ہوئے رسول اللہؐ کے پاس پہنچے اور کہا کہ یا رسول اللہ یہ توراۃ کا نسخہ ہے۔ رسول اللہ خاموش رہے تو اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ کا چہرہ متغیر ہو گیا تو ابوبکر نے کہا۔ تجھے رونے والیاں روئیں تو رسول اللہ کے چہرے کو نہیں دیکھتا اس پر عمر نے رسول اللہ کے چہرے کی طرف نظر کی اور کہا میں اللہ اور اللہ کے رسول کے غضب سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

(ازالۃ الخفاء مقصد اول ص ۱۲۹، مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۶ھ)

حضرت عمر کے زخمی ہونے اور وفات پانے کی تاریخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ طبری نے بھی اس سلسلہ میں کئی روایات درج کی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ۲۷، ذوالحجہ ۲۳ھ کی رات کو وفات پائی اور دوسرے دن صبح کو دفن کئے گئے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق ۲۶، ذوالحجہ ۲۳ھ کو زخمی ہوئے اور محرم کی پہلی تاریخ ۲۴ھ صبح کے وقت دفن ہوئے۔ لیکن اس روایت میں وفات کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ ایک تیسری روایت کے مطابق ۲۶، ذوالحجہ ۲۳ھ کو وفات پائی۔ حضرت عثمان کی بیعت ۲۹، ذوالحجہ کو ہوئی اور آپ نے اپنی خلافت کا آغاز یکم محرم ۲۴ھ سے کیا۔ چوتھی روایت کے مطابق ۲۶، ذوالحجہ ۲۳ھ

کو شہید ہوئے۔ مدت خلافت دس سال چھ مہینے اور چار دن رہی۔

(تاریخ طبری)

مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر نے تین دن بعد انتقال فرمایا اور محرم کی پہلی تاریخ ہفتہ کے دن مدفون ہوئے (الفاروق) مولانا موصوف نے شاید اختلاف روایت کے سبب زخمی ہوتے اور وفات پانے کی تاریخیں درج نہیں فرمائیں۔ اور صرف دفن کی تاریخ پر اعتبار آیا تو وہ تاریخ درج کر دی۔

آج پاکستانی مسلمان بھی دفن ہونے کی تاریخ یعنی یکم محرم کو یوم شہادت قرار دیتے ہیں اور اسی دن سے عشرۂ فاروق کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ زیادہ پرانا نہیں ہے اس نئے سلسلہ کا آغاز شاید اس وجہ سے کیا گیا کہ پہلی محرم سے دس محرم تک ہر طرف نواسۂ رسول حضرت حسین کا سوگ بڑے زور و شور سے منایا جاتا ہے۔ گلی گلی ذکر حسینؑ کے اجتماعات ہوتے ہیں لوگ مدتوں سے ان میں شریک ہونے کے عادی ہیں۔ اور اس طرح سے حسینی فضا میں ذکر فاروق کو برکت دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جانشینی کے لئے شوریٰ کا قیام

حضرت عمر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مگر جاتے جاتے ایک بڑا کام کر گئے اور یہ کام وہ تھا کہ جس کی زحمت آپ نے رسول اللہ کو نہ اٹھانے دی۔ مرض الموت کی تکلیف کا خیال کیا اور کہا کہ ہمیں کتاب خدا کافی ہے۔ مگر خود عالم یہ کہ زخمی پڑے ہیں۔ طبیب جواب دے چکا ہے مگر خلافت کی فکر سر پر سوار ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ جس طرح رسول کے

مرض الموت کے وقت مسلمانوں کے لئے کتاب خدا کافی ہو سکتی تھی۔ آج بھی ہو سکتی ہے۔ مگر نہ ان کے پیش رو حضرت ابوبکر نے یہ سوچا اور نہ انہوں نے۔ ابوبکرؓ نے یہ کیا کہ سیدھے سادے انداز سے حضرت عمر کو نامزد کر دیا۔ مگر حضرت عمرؓ نے ایک شوریٰ تشکیل دی وہ بھی آزاد اور خود مختار نہ تھی۔ اس کا طریقہ کار بھی خود ہی وضع کر دیا۔ شوریٰ کے ممبروں کے انتخاب اور اسکے طریقہ کار کے تعین میں یہ اصول کارفرما نظر آتا ہے کہ ہر صورت میں حضرت عثمان کا انتخاب عمل میں آجائے۔

شوریٰ کے ممبران

۱۔ عبدالرحمٰن بن عوف، یہ حضرت عثمان کے رشتہ دار تھے۔

۲۔ سعد بن ابی وقاص، یہ عبدالرحمٰن بن عوف کے چچا زاد بھائی تھے۔

۳۔ طلحہ کا تعلق حضرت ابوبکر کے قبیلہ یعنی بنو تیم سے تھا اور یہ حضرت علی سے بغض رکھتے تھے۔ جس کا اظہار خود حضرت علی نے بھی کیا۔

۴۔ زبیر بن العوام یہ حضرت علی کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

۵۔ حضرت عثمان بنو امیہ میں سے تھے اور انہی کا انتخاب حضرت عمر چاہتے تھے۔

۶۔ حضرت علی ابن ابی طالب رسول اللہ کی آغوش کے پلے چچا زاد بھائی اور داماد ہونے کے علاوہ اعلیٰ ترین اوصاف کے حامل تھے۔ لہذا ہمیشہ سے خلافت کے سب سے زیادہ مستحق امیدوار تھے۔

طریقہ کار طبری کے مطابق

اگر تین افراد ایک شخص پر متفق ہوں اور تین افراد دوسرے شخص پر متفق ہوں تو عبداللہ بن عمر کو ثالث بناؤ اور فریقین میں سے جس کے

بارے میں وہ فیصلہ کریں اس کا انتخاب کر لیا جائے۔ اگر وہ عبداللہ بن عمر کے فیصلہ کو تسلیم نہ کریں تو تم ان لوگوں کی حمایت کرو جن کے ساتھ عبدالرحمٰن بن عوف ہوں اور باقی لوگوں کو قتل کر دو۔ اگر وہ لوگوں کے مختلف فیصلے سے انحراف کریں۔

مجلسِ شوریٰ اور اس کے طریقہ کو دیکھ کر خود حضرت علی کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ خلافت انہیں نہیں مل سکے گی۔

" وہ (خلافت) ہمارے پاس سے چلی گئی۔" وہ بولے " تمہیں کیسے معلوم ہوا" وہ کہنے لگے۔ عثمان کو میرے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ اور انہوں (حضرت عمر) نے فرمایا ہے تم اکثریت کے ساتھ دینا۔ نیز اگر دو افراد کسی ایک کی حمایت کریں اور دوسرے دو افراد کسی اور کی حمایت کریں تو تم ان کے ساتھ رہو جن میں عبدالرحمٰن بن عوف شامل ہوں۔ لہٰذا سعد اپنے چچا سعد بھائی کی مخالفت نہیں کریں گے۔ عبدالرحمٰن بن عوف عثمان کے رشتہ دار ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ عبدالرحمٰن بن عوف عثمان کو خلیفہ مقرر کریں گے۔ یا عثمان عبدالرحمان بن کو خلیفہ مقرر کریں گے۔ اگر باقی دو (طلحہ اور زبیر) بھی میرے ساتھ رہے تو ان سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ بلکہ مجھے صرف ایک ہی سے (حمایت کرنے کی) توقع ہے۔"

(تاریخ طبری حصہ سوم ——— ص ۲۹۲، ۲۹۳)

حضرت عمرؓ کی حکمرانی

حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ حکومت میں جو کچھ کیا۔ اس کا دو طرح سے جائزہ لیا جانا چاہیئے۔ نیابت رسول کے معیار پر اور دنیادی حکمرانی کے معیار پر۔ اس کے بغیر حضرت عمر کے مقام فضیلت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

بحیثیت نائب رسولؐ

فتوحات

حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہوتے ہی فتوحات کی طرف توجہ کی اور یہ سلسلہ آپ کے پورے دورِ خلافت میں جاری رہا۔ فتوحات کے نتیجہ میں بڑے وسیع علاقے قبضہ میں آگئے۔ بے پناہ دولت ہاتھ آئی۔ لاکھوں انسان مارے گئے۔ ہزاروں انسان غلام بنالئے گئے۔ ان فتوحات کو حضرت عمر کا عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اور ہمارے مورخین نے انہیں عجوبہ روزگار فاتح کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تمام جنگیں کسی شرعی یا اخلاقی جواز کے بغیر لڑی گئیں (ہم نے جہاں جنگوں کا حال بیان کیا ہے وہاں ہر جنگ کے عدم جواز اور اصل وجوہات پر گفتگو کی ہے) اور دورانِ جنگ اسلامی اصولوں کا بھی پاس ولحاظ نہ رکھا گیا۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اور بھلے گئے

والوں کو پیچھا کر کے قتل کیا گیا۔ بازار پر حملہ کر کے پرامن دوکانداروں کو لوٹا گیا۔ خالد بن ولید نے مالک بن نویرہ کو بے گناہ قتل کیا اور ان کی بیوی کے ساتھ زنا بالجبر کیا۔ اس کے علاوہ جو وہ فتح کے بعد ظلم وستم کا بازار گرم رکھتے تھے وہ الگ رہا۔

نائب رسولؐ کی حیثیت سے حضرت عمر پر واجب تھا کہ وہ بلا جواز جنگوں کا سلسلہ شروع نہ کرتے اور شروع ہی کر دیا تھا تو کم از کم اپنے سالاروں سے دوران جنگ اسلامی اصولوں کی سختی کے ساتھ پابندی کرواتے۔ مگر ایسی کوئی روایت نہیں ملتی کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ آپ نے اس سلسلہ میں کیا کیا۔ ان اصولوں کو توڑنے پر کسی سپہ سالار کو کوئی سزا دی یا نہیں۔ اگر کوئی روایت ملتی ہے تو یہ ملتی ہے کہ خود آپ نے اسلامی اصولوں کے خلاف جنگی نوعیت کی ہدایات بھیجیں۔

آپ نے سعد بن ابی وقاص کو جنگ قادسیہ کے سلسلہ میں ایک خط لکھا اس خط میں یہ عبارت بھی تحریر ہے: "جنگ جیتو تو بھاگتی ہوئی مشرک فوجوں کو پیچھے سے موت کے گھاٹ اتار دو۔"

(حضرت عمر کے سرکاری خطوط ص ۱۵۴)

سب سے بڑھ کر ظلم ڈھانے والے مثنےٰ اور خالد تھے۔ مثنےٰ نے خود حضرت عمر کے دور کی جنگوں میں مظالم کئے۔ (مگر خالد سے بہت کم) مگر ان سے کوئی باز پرس نہیں کی گئی۔ خالد بن ولید کے چنگیزی مظالم گو حضرت ابوبکر کے دور کے ہیں، مگر ان کو محض سرداری سے معزول کرنا انصاف کے تقاضوں بجائے سیاست اور مصلحت وقت کے تقاضوں کے مطابق تھا۔ مجرم مجرم رہتا ہے چاہے جرم کئے ہوئے عرصہ

گزر جائے۔ ہمارے سامنے علی ابن ابی طالب کی مثال موجود ہے کہ عبیداللہ ابن عمر کو حضرت عثمان نے تہرے قتل پر سزا نہیں دی اور علی انہیں قابلِ گردن زدنی سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت علی کا دورِ خلافت آتے ہی عبیداللہ شام بھاگ گئے کہ علی ضرور قصاص لیں گے اور اگر عبیداللہ بھاگ نہ جاتے تو ہوتا بھی یہی۔

کتاب و حکمت کی تعلیم اور تزکیۂ نفس

رسول اللہ صلعم کا اصل کام کتاب و حکمت کی تعلیم اور نفسوں کا تزکیہ تھا۔ چنانچہ نائب رسول کا بھی اصل کام یہی ہونا چاہیے تھا اب ہم دیکھیں گے کہ حضرت عمرؓ نے یہ فرض کس حد تک پورا کیا اور ان میں یہ فرض پورا کرنے کی کتنی قابلیت تھی۔

ڈاکٹر خورشید احمد فارق پروفیسر دہلی یونیورسٹی لکھتے ہیں کہ "مختصر نویسی کا سب سے بڑا سبب تو سرکاری کاموں کا ہجوم اور دفتری عملہ نیز منشیوں کا فقدان تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ عمر فاروقؓ دوسرے تینوں خلفاء کی طرح باقاعدہ پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے۔

(عمر فاروق کے سرکاری خطوط ادارہ اسلامیات لاہور ص ۱۴)

حضرت عمر نہ تو باقاعدہ پڑھے لکھے آدمی تھے اور نہ ہی قرآن و حدیث سے زیادہ واقف۔ دراصل آپ کو رسول اللہ صلعم کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا موقعہ کم ملتا تھا۔ آپ کا قیام مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ آپ اپنا زیادہ تر وقت تجارتی کاموں میں گزارتے اور تقریباً ایک دن بیچ تھوڑی دیر کے لئے رسول اللہ

کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

اپنی خلافت کے زمانہ میں علمی مجلس منعقد کر کے خاص طور سے قرآنی آیات کو سمجھتے، علم میں اضافہ کرتے۔ آج جو یہ سننے میں آتا ہے کہ حضرت عمر سب سے بڑے فقیہ تھے تو اس کا سبب خود ان کا فہم قرآن و حدیث نہ تھا بلکہ اصل صورت حالی وہ تھی کہ جو شبلی نعمانی فرماتے ہیں۔

فقہ کا بہت بڑا حصہ جو منقح ہوا اور جو فقہ عمری کہلاتا ہے انہی علمی مجلسوں کی بدولت ہوا۔ اسی مجلس کے بڑے ارکان ابی بن کعب زید بن ثابت، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس عبدالرحمان بن عوف، حر بن قیس تھے۔

(الفاروق صہ ۲۴۵)

امیرالمومنین ہونے کی وجہ سے لوگ آپ سے دینی مسئلے دریافت کرتے اگر آپ کو اپنی رائے پر اطمینان نہ ہوتا تو علم و بصیرت رکھنے والے صحابہ کرام کو جمع فرماتے اور ان سے رائے طلب کرتے پھر فیصلہ دیتے۔ بعض اوقات کسی مسئلہ کا جواب نہ دے پاتے تو اس کا صاف لفظوں میں اعتراف کر لیتے۔ شاہ ولی اللہ ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں کہ "ابوبکر بروایت ابی نفرہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر فاروق کی خدمت میں آیا اور بیان کیا کہ میری ایک کنیزہ کے ساتھ اس کی بیٹی بھی ہے اور دونوں مجھے پسند ہیں۔ کیا میں ان دونوں کو اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔ فرمایا ایک آیت سے اس کی حلت ہوتی ہے۔ اور ایک سے حرمت مگر میں اس فعل کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔ (ازالۃ الخفاء مقصد دوم کتاب النکاح صہ ۲۱۵)

اگر کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تو خاص طور سے علی بن ابی طالب سے پوچھتے کئی ایسے مسئلے بھی سامنے آئے کہ اگر حضرت علی رہنمائی نہ فرماتے تو جناب عمرؓ ہلاکت میں پڑ جاتے۔ چنانچہ آپ کہا کرتے تھے "لولا علی لھلک عمر" یعنی اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ ایک موقعہ پر آپ نے فرمایا۔ الہٰی تو مجھ پر کوئی سخت معاملہ نہ پیش کر مگر یہ کہ میرے پاس ابوالحسن ہوں۔

(ازالۃ الخفاء مقصد دوم مآثر علی بن ابی طالب ص ۵۲۳، ۵۲۵)

بعض اوقات حضرت عمرؓ ابن خطاب عجیب غریب فیصلے کرتے یہ شاید اس وقت ہوتا کہ جب آپ کے پاس کوئی قابل احترام صاحب الرائے صحابی نہ ہوتا اور آپ اپنی مخصوص کیفیت میں فیصلہ دیتے۔

چند نمونے۔

۱۔ امام مالک بروایت یحییٰ بن سعید وہ سعید بن المسیب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق کی خدمت میں ایک مسلم و یہودی مقدمہ لیکر آئے آپ نے دیکھا کہ حق یہودی کا ہے آپ نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ یہودی کہنے لگا واللہ آپ نے فیصلہ بحق کیا۔ آپ نے اسکے ایک درہ لگایا اور فرمایا تو کیونکر سمجھا۔

۲۔ امام مالک بروایت ہشام بن عروہ اور وہ اپنے والد سے وہ عبدالرحمٰن بن حاطب سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے غلاموں نے قبیلہ مزینہ میں سے ایک شخص کی اونٹنی چرا لی اور اسے ذبح کر دیا مقدمہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں لایا گیا۔ آپ نے کثیر بن الصلت کو فرمایا کہ ان غلاموں کے ہاتھ کٹوا دو۔ پھر فرمایا کہ انہیں کوئی اور سزا دو۔ حاطب سے فرمایا میں تاوان دلا کر تمہیں ایسا قرضدار کروں گا کہ

تم بھی یاد کرو گے۔ اس کے بعد اس مزنی شخص سے پوچھا گیا تمہاری اونٹنی کس قیمت کی تھی اس نے کہا واللہ میں اسے چار سو درہم میں بھی نہ دے سکتا۔ آپ نے حاطب سے فرمایا اسے آٹھ سو درہم دے دو۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ دگنی قیمت بڑھا دینے میں اس روایت پر ہمارا عمل نہیں۔

۳۔ امام مالک بروایت نافع بیان کرتے ہیں کہ ایک غلام جمالیک خمس کی نگہبانی پر مامور تھا اس نے ایک جاریہ سے زنا بالجبر کیا۔ حضرت عمر فاروق نے اسے حد ماری اور شہر بدر کر دیا۔ اور جاریہ کو حد ماری اس لیے کہ غلام نے اس پر جبر واستکراہ کیا تھا۔

۴۔ امام مالک بروایت یحیٰی بن سعید وہ سعید بن المسیب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق نے ایک ایسے شخص کے پیچھے پانچ شخصوں کو جنہوں نے اس شخص کو قتل کیا تھا۔ قتل کیا۔ اور فرمایا اگر سب اہل سفار مل کر اسے قتل کرتے تو میں ان سب کو قتل کر دیتا......

۵۔ امام شافعی روایت فرماتے ہیں کہ انہیں خبر دی۔ امام محمد بن الحسن نے انہیں امام ابو حنیفہ نے وہ اپنے شیخ حماد سے وہ ابراہیم نخعی سے روایت فرماتے ہیں کہ قبیلۂ بکر بن وائل میں سے ایک شخص نے اہل حیرہ میں ایک شخص کو قتل کیا۔ حضرت عمر نے اس کی بابت تحریر فرمایا کہ قاتل اولیاء مقتول کو دے دیا جائے۔ خواہ وہ اسے قتل کریں خواہ معاف کریں۔ چنانچہ قاتل اہل حیرہ میں سے ایک نامی شخص کو دے دیا گیا اور اس نے اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر فاروق نے تحریر فرمایا کہ اگر قاتل ابھی قتل نہ کیا گیا ہو۔

اسے قتل نہ کرو۔ لوگوں نے سمجھا کہ آپ کا ارادہ یہ ہے کہ اولیاء مقتول کو دیت دے دیکر رضامند کر لیا جائے۔

(ازالۃ الخفاء مقصد دوم صہ ۲۴۰ تا ۲۴۶)

حضرت عمرؓ کے یہ فیصلے منصفی کی تاریخ کے نادر نمونے ہیں۔ ذرا غور فرمایئے کہ

۱۔ یہودی کے حق میں فیصلہ دیا تو بیچارے کے منہ سے خوشی میں نکل گیا کہ واللہ آپ نے سچی فیصلہ کیا تو آپ نے اس تعریف کے بدلے اسے ایک کوڑا رسید کیا۔ کیا یہ کوئی خطا تھی؟

۲۔ پہلے تو چوری کرنے والے غلاموں کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ پھر کہا نہیں کوئی اور سزا دو۔ پھر غلاموں کے مالک حاطب سے اونٹنی کے مالک کو دگنی قیمت دلوائی۔ اور یہ کہہ کر دلوائی کہ تمہیں ایسا قرضدار کروں گا کہ یاد کرو گے۔ پہلے ایک سزا سنانا پھر بغیر کسی ظاہری سبب کے یکایک فیصلہ بدل کر دوسرا فیصلہ سنا دینا کہ کوئی اور سزا دی جائے پہلے تو چوری کرنے والے غلاموں کے ہاتھ کاٹنے کی سزا دینا اور پھر یہ کہنا کہ نہیں! کوئی اور سزا دو اور اس طرح بغیر کوئی معقول وجہ بتائے فیصلہ بدل دینا، پھر حاطب کو ہتکانہ انداز سے دھمکی دیکر اونٹنی کے مالک کو دوگنی رقم دلوا دینا۔ نائب رسولؐ کو زیب دیتا ہے۔

۳۔ مظلوم جاریہ کے ساتھ زنا بالجبر کی گئی تو اس میں اس کی کیا خطا تھی۔ اس مظلوم پر کوڑے کیوں برسائے گئے۔؟

۴۔ عدل و انصاف بہت ٹھنڈے دماغ سے قانون کے عین مطابق کیا جاتا ہے۔ جلال کی حالت میں نہیں۔

۵۔ یہاں بھی فیصلہ بدل دیا گیا۔ قاتل کو اولیاء مقتول کے حوالہ

کر دیا کہ وہ چاہیں تو اسے قتل کر دیں یا معاف کر دیں پھر حکم بھیجا کر اگر قاتل ابھی قتل نہ کیا گیا ہو تو قتل نہ کیا جائے اور وہاں قاتل کو قتل کیا بھی جا چکا تھا۔

اس طرح کے فیصلے کہیں دیکھے نہ سنے اور فیصلے کرنے والا بھی کون۔ نائب رسول۔ امیر المومنین۔ اس سطح کے آدمی کے جذبات مستحکم اور بات جچی تلی، فیصلہ کن اور قانون کے مطابق ہونا چاہیئے مگر بات صرف مقدمات کے فیصلہ کی نہیں ہے حضرت عمرؓ کی زندگی میں تو قدم قدم پر پچھاوا ملے گا۔

کتاب و حکمت کی تعلیم

جب فہم کتاب ہی نہ ہو تو کتاب و حکمت کی تعلیم کیسی اور پھر طبیعت کا عدم توازن سونے پر سہاگہ .... صورت حال یہ ہو تو نتیجہ ظاہر ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ڈاکٹر خورشید احمد فارق لکھتے ہیں۔

ایک عرب عمر فاروق کے پاس آیا اور بولا۔ امیر المومنین النازعات غرقاً کے کیا معنی ہیں؟ انہوں نے پوچھا تم کون ہو؟ نووارد، میں بصرہ کا باشندہ ہوں۔ میرا تعلق قبیلہ تمیم کی شاخ بنو سعد سے ہے۔ اچھا تو تو ایک اجڈ قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ میں تیرے گورنر کو ایسا خط لکھتا ہوں جو تو ناپسند کرے گا۔ یہ کہہ کر انہوں نے اسے اتنے زور کا دھکا دیا کہ اس کی ٹوپی گر گئی اور اس کے لمبے گھنے بال کھل گئے۔ عمر فاروق، اگر تیرے بال منڈے ہوتے تو مجھے تیرے بارے میں پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر یہ خط

ابو موسیٰ کو لکھا۔

البیغ بن علیم تمیمی کار آمد باتوں (قرآن کی واضح آیات) کو چھوڑ کر غیر ضروری اور دوراز کار باتوں (مشکلات و متشابہات قرآن) کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ میرا یہ خط جب وصول ہو تو سارے مسلمان البیغ کے ساتھ خرید و فروخت بند کردیں۔ اگر وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کو نہ جائیں، اگر اس کا انتقال ہو تو کوئی اس کے کفن دفن میں شریک نہ ہو۔

(کنز العمال ۱/ ۲۲۹ - ۲۳۰)

ایک دوسری روایت کے مطابق صبیغ تمیمی عمر فاروق کے پاس آیا اور بولا الذاریات ذرواً کا کیا مطلب ہے؟ عمرؓ فاروق: ذاریات کے معنی ہیں ہوائیں۔ اگر میں نے رسول اللہ کی زبان سے یہ معنی نہ سنے ہوتے تو اپنی طرف سے نہ کہتا۔ صبیغ: والحاملات وقراً کا کیا مطلب ہے؟ عمر فاروق: حاملات کے معنی ہیں بادل، اگر میں نے رسول اللہ کی زبان سے یہ معنی نہ سنے ہوتے تو اپنی طرف سے نہ کہتا، صبیغ والمقسمات امراً کا کیا مفہوم ہے؟ عمر فاروق: مقسمات کی تفسیر ہے ملائکہ، اگر میں نے رسول اللہ کی زبان سے یہ تفسیر نہ سنی ہوتی تو اپنی طرف سے ایسا نہ کہتا۔ اس کے بعد عمر فاروق نے صبیغ کے سو کوڑے لگوائے اور ایک کوٹھری میں بند کروا دیا۔ جب اس کے زخم ٹھیک ہو گئے تو اسے بلایا اور مزید سو کوڑے لگوائے، پھر اسے ایک اونٹ پر بٹھایا اور ابو موسیٰ کے نام ایلچی کو یہ خط دیکر اسے بصرہ بھیج دیا۔

لوگوں کو اسکے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی ممانعت کردو۔

(کنز العمال ۱/ ۲۶۶)

اور اس کا سالانہ وظیفہ بند کردو۔ (ابن حجر ۲/۱۹۸) اور اسکے ساتھ خرید و فروخت بند کردو۔ (ابن جوزی صد ۹۳)
(حضرت عمر فاروق کے سرکاری خطوط، ادارہ اسلامیات لاہور صد ۲۳۷ - ۲۳۸)

حضرت عمر لوگوں کے نفوس کا تزکیہ اکثر کوڑے مار کر کرتے اور اس میں صحابی اور غیر صحابی کی کوئی تمیز نہ ہوتی۔ حالانکہ یہ طریقہ نہ کبھی رسول اللہ نے اختیار کیا۔ اور نہ کبھی باقی خلفاء ثلاثہ نے۔
ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں۔

"حضرت عمر پہلے شخص ہیں۔ جس نے ہاتھ میں درّہ تھام لیا اور بڑے اور چھوٹے کی تمیز کیۓ بغیر ان تمام لوگوں کو کوڑے لگانے شروع کیۓ جو ذرا بھی راہ اعتدال سے جو اسلام کی صحیح راہ تجاوز کرتے تھے۔ ایک دن جس وقت کہ آپ مسلمانوں کو مال غنیمت تقسیم کرنے کے لئے تشریف فرما تھے۔ آپ نے خود دولت کسریٰ او عجم کے فاتح اعظم سعد ابن ابی وقاص کو بر سرعام کوڑے مارے تھے۔"
ہوا یہ تھا کہ

حضرت سعد لوگوں کے ہجوم سے گزرتے ہوئے حضرت عمر کے قریب آگئے تھے۔ فاروق عادل نے اس موقع پر انہیں للکارا تھا۔ اور کوڑے مارتے ہوئے یہ کہا تھا۔

تم روئے ارض پر اقتدار خداوندی کے مظہر سے خائف نہ ہوئے تو میں نے چاہا کہ تم پر یہ بات روشن کردوں کہ اقتدار خداوندی کا مظہر بھی تمہاری پرواہ نہیں کرے گا۔
(اردو ترجمہ الشیخان، نفیس اکیڈمی کراچی صد ۵۲۵)

یعنی حضرت عمر کو اس بات پر غصہ نہیں آیا کہ سعد نے اپنی باری کا انتظار کیوں نہ کیا۔ اور لوگوں کے بیچ میں سے کیوں آگئے۔ بلکہ آپ اس بات پر مشتعل ہو گئے کہ وہ ظلِ الٰہی سے کیوں نہ ڈرے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب کو اس میں عدل کا کون سا پہلو نظر آگیا کہ حضرت عمر کا نام لینے کے بجائے بڑے جذبہ سے فاروق عادل ارشاد فرمایا۔

اِسے کیا کہیے!

لختِ جگر پر کوڑوں کی بارش:

حضرت عمر کا اپنے فرزند ابو شحمہ پر حد جاری کرنے کا واقعہ زبان زدِ عام ہے اور یہ بات مشہور ہے کہ ابن عمر نے کوڑے کھاتے کھاتے دم توڑ دیا تھا۔ مگر تاریخ میں کئی مختلف روایتیں ملتی ہیں۔ ہم ان روایتوں کو (مختصراً) لکھ رہے ہیں کہ جنہیں حضرت شاہ ولی نے ازالۃ الخفاء، درج کیا ہے۔

(ابن عباس سے) فرمایا میں ایک روز مسجد نبوی میں تھا اور بہت سے لوگ حضرت عمر فاروق کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک جوان لڑکی آئی اور کہا السلام علیک یا امیر المومنین فرمایا وعلیک السلام ورحمۃ اللہ کیا تجھے کچھ کہنا ہے۔ کہا ہاں' یہ لڑکا آپ کا ہے۔ جو میرے شکم سے ہے۔ فرمایا میں تو تجھے پہچانتا بھی نہیں لڑکی رونے لگی اور عرض کیا اے امیر المومنین اگرچہ یہ آپ کی پشت سے نہیں لیکن یہ آپ کے لڑکے کا لڑکا ہے۔ فرمایا حلال سے ہے یا حرام سے؟ عرض کیا میری جانب سے حلال سے فرمایا یہ کس طرح ذرا اللہ سے ڈر کر سچ سچ

بیان کرنا۔ عرض کیا اے امیر المومنین عرصہ ہوا کہ میں ایک روز بنی نجار کے باغ کے پاس سے گزر رہی تھی کہ آپ کا لڑکا ابوشحمہ بحالت خمار میرے پاس آیا اور شراب اس نے یہودیوں کی قربان گاہ میں پی تھی اس نے مجھے ورغلایا اور باغ کی طرف کھینچ کر لے گیا اور مطلب براری کی اور مجھے غش طاری ہو گئی۔

حضرت عمر فاروق نے منادی کو حکم دیا۔ اس نے منادی کی اور لوگ مسجد میں جمع ہو گئے۔۔۔۔۔۔ پھر آپ نے مکان پر آ کر پوچھا کیا یہاں ابوشحمہ ہے۔ کہا گیا ہاں، وہ ابھی کھانا کھانے بیٹھے ہیں۔ آپ اندر گئے اور کہا اے فرزند من کھانا کھا لو شاید کہ یہ تمہارا آخری کھانا ہو۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ لڑکے کا چہرہ متغیر ہوا اور کانپ کر لقمہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ انہیں کھینچ کر مسجد میں اصحاب رسول اللہ صلعم کے سامنے لے آئے اور فرمایا عورت سچ کہتی ہے۔ ابوشحمہ نے اقرار کر لیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ نے ابوشحمہ کے کپڑے اتروائے اور لوگ بآواز رونے لگے۔ ابوشحمہ کہنے لگا یا ابت ارحم۔ اے پدر من مجھ پر رحم کیجیے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اے افلح مارنا شروع کرو۔ اس نے مارنا شروع کیا اور ابوشحمہ فریاد کرتے جاتے تھے۔ جب افلح ستر درے تک پہنچا تو ابوشحمہ نے کہا اے پدر من مجھے ایک گھونٹ پانی پلا دیجیے۔ فرمایا اے فرزند من اگر پروردگار تمہیں پاک کر دے گا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حوض کوثر کا پانی پلائیں گے۔ جس کے بعد کبھی پیاسے نہ ہو گے۔ پھر فرمایا اے افلح مارو۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔ جب نوے پر نوبت پہنچی ابوشحمہ خاموش ضعیف ہو گئے اور زبان بند ہو گئی۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ ہم نے اصحاب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کر حضرت عمر فاروق سے کہنے لگے کہ اب جس قدر حد باقی رہتی ہے۔ آپ دوسرے وقت پر رہنے دیں۔ فرمایا جب معصیت میں دیر نہیں کی گئی تو حد میں کیوں کر تاخیر کی جا سکتی ہے کسی نے اسی وقت والدہ ابوشحمہ سے فریاد کی تو وہ روتی ہوئی دوڑ کر آئیں اور کہنے لگیں میں ایک ایک باقی درّے کے عوض پیدل چل کر حج کروں گی اور اس قدر صدقہ دوں گی۔ فرمایا حج و صدقہ حد کے قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ افلح تم حد پوری کرو۔ جب حد کے آخری درّے پر نوبت پہنچی تو ابوشحمہ چیخے اور زمین پر گر پڑے .... باپ تجھ پر قربان ہو تجھے حق نے قتل کیا۔

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت عمر فاروق کا ایک لڑکا تھا جس کا نام ابوشحمہ تھا۔ ایک روز اس نے بیان کیا کہ میں مرتکب زنا ہوا ہوں۔ آپ مجھ پر حد قائم کریں .... آپ نے اس سے چار دفعہ اقرار کرایا .... آپ نے فرمایا اے معاشر المسلمین اسے حد مارو۔ ابوشحمہ نے کہا اے معاشر المسلمین جس نے زمانہ جاہلیت یا اسلام میں مجھ جیسا فعل کیا ہو وہ مجھے حد نہ مارے۔ بعد ازاں حضرت علی مرتضٰے کرم اللہ وجہہ کھڑے ہوئے اور حضرت امام حسنؓ سے کہا اس کا داہنا بازو پکڑ لو۔ انہوں نے داہنا بازو پکڑ لیا اور حضرت امام حسینؓ سے کہا تم اس کا بایاں بازو پکڑ لو۔ انہوں نے بایاں بازو پکڑ لیا۔ حضرت علی مرتضٰے کرم اللہ وجہہ نے سترہ درّے مارے تھے کہ ابوشحمہ بے ہوش ہو گئے۔ بعد ازاں حضرت علی مرتضٰے کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جب تم اللہ تعالیٰ سے ملو تو کہنا کہ مجھے اس شخص نے

حد ماری ہے جس کے ذمہ کوئی حد نہیں۔ بعد ازاں حضرت عمر فاروق کھڑے ہوئے اور سو درے پورے کئے اور ابو شحمہ نے انتقال کیا۔

عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ میں بمقام بصرہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھ سے کہا گیا کہ عبدالرحمان بن عمر اور ابو سروعہ آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا آنے دو۔ جب وہ آئے تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں مضمحل ہیں۔ آتے ہی انہوں نے کہا کہ ہم پر حد قائم کریں کیونکہ آج شب کو ہم شراب نوشی میں مبتلا ہوئے تھے۔ .... میں ان دونوں کو مکان کے صحن میں لے گیا اور انہیں حد ماری اس کے بعد عبدالرحمان بن عمر نے مکان کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر سر منڈوایا۔ کیونکہ حد مارنے کے بعد سر منڈوایا کرتے تھے۔ میں نے واللہ حضرت عمر فاروق کو اس کے متعلق ایک حرف نہیں لکھا یہاں تک کہ آپ کا نامہ آیا۔ جس میں آپ نے لکھا تھا ....

تم نے عبدالرحمان کو اپنے گھر میں حد ماری اور گھر ہی میں اس کا سر منڈوایا حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ میرا عملدرآمد اس کے خلاف طریقہ پر ہے۔۔

...... عبدالرحمان کو پالان سے باندھ کر میرے پاس بھیج دو۔

چنانچہ حضرت عمرو بن العاص نے عبداللہ بن عمر کی ہمراہی میں انہیں بھیج دیا۔ اور ایک عریضہ معذرت لکھ بھیجا کہ میں نے بے شک عبدالرحمان کو اپنے مکان کے صحن میں حد ماری۔ مگر اس ذاتِ پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ جس کے آگے کسی کی قسم نہیں کھائی جاتی۔ میں مسلم اور ذمی دونوں کو یہی مکان میں حد مارتا ہوں۔ جب عبداللہ بن عمر عبدالرحمان کو لے کر پہنچے تو انہوں نے عبدالرحمان کو اتار دیا پالان میں باندھنے کی وجہ سے ان کی حالت ہوگئی کہ چل نہیں سکتے تھے۔

حضرت عمر فاروق نے ان سے پوچھا کہ تم شراب نوشی کے مرتکب ہوئے ہو تو عبدالرحمان بن عوف نے ان کی طرف سے گفتگو کی کہ اے امیرالمومنین ان پر حد ماری جا چکی ہے۔ مگر آپ نے ان کے کہنے پر کچھ التفات نہیں کیا اور عبدالرحمان چلانے لگے کہ میں تو مریض ہوں آپ مجھے مار ڈالیں گے۔ غرض آپ نے انہیں دوبارہ حد ماری۔ جس سے زیادہ بیمار ہو کر انہوں نے انتقال کیا۔

(ازالۃ الخفاء، مقصد دوم صہ ۳۰۹ تا ۳۱۴)

ان تین مختلف روایتوں کی موجودگی میں یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی روایت صحیح ہے۔ مگر عمرو بن العاص والی روایت زیادہ مشہور ہے۔

ان تینوں روایتوں کو پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے (اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو) ان میں یہ نظر آتا ہے کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو انتہائی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ عین کھانا کھاتے وقت بیٹے کے سر پہ پہنچ جاتا ہے اور بیٹے کے ہاتھ سے لقمہ گر جاتا ہے۔ اور باپ اس کا گریبان پکڑ کر کھینچتا ہوا مجمع عام میں لے جاتا ہے۔ کوڑوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ بیٹا پیاس سے بلبلا کر باپ سے پانی مانگتا ہے مگر پانی نہیں دیا جاتا۔ نوے کوڑے کھانے کے بعد بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے صحابہ مشورہ دیتے ہیں کہ باقی درے اس وقت لگا لیجئے گا جب حالت سنبھل جائے۔ مگر باپ نہیں مانتا۔ بیٹے کی ماں تڑپ تڑپ کر فریاد کرتی ہے۔ مگر باپ پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ غلام سے کہتا ہے۔ حد پوری کرو۔ غلام پھر کوڑا اٹھا لیتا ہے۔ آخری کوڑے پر ایک چیخ بلند ہوتی ہے اور بیٹا دم توڑ دیتا ہے۔

باپ اس وقت اپنی تمام تر کارروائی پر فخر کرتا ہے اور اس کے عقیدت مند آج تک فخر کرتے ہیں کہ اسلام میں حدود اللہ یوں قائم ہوتی ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا یہ انسانی تقاضے نہیں ہیں کہ اگر مجرم کھانا کھا رہا ہے تو اسے سکون سے کھانا کھا لینے دیا جائے کیا حدود اللہ کے قیام میں اتنی سی بھی گنجائش نہیں اور کیا یہ بھی حد میں شامل ہے کہ مجرم کو پیاسا مارا جائے۔ کیا اصحاب نبی خلاف شرع مشورہ دے رہے تھے کہ دس درّے حالت سنبھل جانے کے بعد مار لیجئے گا۔

عمرو بن العاص والی روایت تو اور دل ہلا دینے والی ہے وہاں معاملہ صرف شراب کا تھا۔ جس کی حد حضرت عمر نے خود اسی کوڑے مقرر کی تھی۔ پھر بیٹے کے ساتھ یہ قہر کیوں کہ سو کوڑے مارے گئے اور پھر یہ کہ حد تو جاری کی جا چکی اب یہ عمرو بن العاص جانیں کہ انہوں نے گھر میں کیوں جاری کی۔ اگر حد شرعی تقاضوں کے مطابق نہیں لگی تھی تو اس کے ذمہ دار عمرو بن العاص تھے نہ کہ ابو شحمہ اور پھر یہ کیسا ظلم کہ بیٹے کے لئے یہ حکم دیا جائے کہ اسے پالان میں کس کر روانہ کرو۔ لڑکا اس اذیت ناک سفر میں بیمار و لاغر ہو گیا۔ مگر باپ ہے کہ ذرا نہیں پسیجتا اور اسی حالت میں کوڑے لگانے پر تلا ہوا ہے۔ بیٹا فریاد کرتا ہے کہ بابا جان میں تو بیمار ہوں آپ مجھے مار ڈالیں گے اور ادھر مشہور صحابی عبدالرحمان بن عوف سمجھا رہے ہیں کہ اس پر تو حد جاری کی جا چکی ہے مگر باپ پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا اور وہ حد لگوا دیتا ہے۔ جس کے صدمہ سے بیٹا بیمار پڑ جاتا ہے اور اسی بیماری میں انتقال ہو جاتا ہے۔

اہل دل انصاف کریں کہ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو پھر یہ بے رحمانہ قتل ہوا۔ یا حدود اللہ کا قیام؟

خوبصورتی کی بھیانک سزا

ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:

شب گردیوں میں بسا اوقات بڑے بڑے لطائف پیش آجاتے ہیں۔ جن سے انسان محظوظ بھی ہوتا ہے اور مرعوب بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک رات کو آپ نے ایک عورت کو کہتے ہوئے سنا۔

کیا شراب پینے کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے یا کوئی سلسلہ ایسا نکل سکتا ہے کہ میں نصر ابن حجاج تک پہنچ جاؤں۔

صبح ہوتے پر جب حضرت عمرؓ نے نصر ابن حجاج کے بارے میں پوچھا تو آپ کو بتایا گیا کہ وہ قبیلۂ سلیم کا ایک شخص ہے۔

آپ نے اسے حاضر کئے جانے کا حکم دیا۔ اب جو آپ اسے دیکھتے ہیں تو وہ ایک خوبصورت اور جوان رعنا کی حیثیت سے سامنے تھا۔ اس کے بالوں میں بھی حسن تھا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس کے بال ترشوا دیئے جائیں۔ بال کٹوا کے جب یہ شخص آیا تو اس کا حسن و جمال اور نکھر آیا۔

اب اس شخص کو عمامہ باندھنے کا حکم ہوتا ہے۔ اس سے بھی اس کے بانکپن اور تیکھے پن میں اضافہ ہی ہوتا گیا کمی نہ واقع ہوئی۔ یہ دیکھنے کے بعد حضرت عمرؓ نے قسم کھالی کہ اس جامہ زیب شخص کو مدینہ میں بسنے نہ دیں گے۔ چنانچہ آپ فی الفور اس جوان رعنا کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے سپاہی کی حیثیت سے بھرتی کر کے بصرہ بھجوا دیا۔

(اردو ترجمہ الشیخان، نفیس اکیڈمی کراچی صہ ۱۹۱)

اس بیچارے کی کیا خطا تھی کہ اسے اپنے وطن سے اجاڑ اگیا۔
اس کی ماں اسکی جدائی میں روتی پیٹی عشق کا اظہار کیا تھا تو اس عورت

نے اور سزا ملی بیچارے نصر کو۔ حضرت عمر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ
کہ موصوف شعری ذوق بھی رکھتے تھے۔ مگر لگتا ایسا ہے کہ آپ کی طبیعت
میں لطافت نام کو نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ عورت تنہائی شب میں
محض دل بہلانے کے لیئے اشعار پڑھ رہی ہو۔ اور سنجیدگی سے عشق نہ
کر رہی ہو۔ اگر حضرت عمر یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ سنجیدگی سے عشق کر رہی
ہے۔ تو پھر آپ کو چاہیے تھا کہ اسے اس کے محبوب سے ملانے کی
کوئی شرعی صورت نکالتے۔

عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا عشق

حضرت عمر کا ایک عاشق کے ساتھ تو یہ سلوک اور ایک کے
ساتھ یہ کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان متضاد کیفیات پر۔ قصہ کچھ
یوں ہے کہ:

ابوبکر صدیق کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کپڑے کے تاجر تھے
شام کے ایک تجارتی سفر میں ان کا گذر دمشق سے ہوا تو وہاں کے
ایک غسانی رئیس جودی کی حسین لڑکی لیلیٰ کو دیکھ کر اس کے متوالے
ہو گئے۔ انہوں نے لیلیٰ کے بارے میں غزلیہ شعر بھی کہے۔ جن کا مدینہ
میں خوب چرچا ہوا۔ عمر فاروق نے ان سے وعدہ کر لیا کہ اگر لیلیٰ مالِ
غنیمت میں مسلمانوں کے ہاتھ آئی تو ان کے حوالے کر دیں گے۔ انہوں
نے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی معرفت شامی افواج کے سالار اعلیٰ ابو عبیدہ
بن جراح کو یہ خط بھیجا۔

"جب خدا تمہارے ہاتھوں دمشق فتح کرائے تو جودی کی لڑکی
عبدالرحمٰن کو دے دینا۔ ابن حجر ۲/۴/۴۰۴
(حضرت عمر کے سرکاری خطوط' ادارۂ اسلامیات لاہور ص ۸۷)

ذمیوں کے ساتھ سلوک :

حضرت عمرؓ امرائے اجناد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔
عورتوں اور بچوں پر جزیہ نہیں ہے۔ صرف بالغ مردوں پر جزیہ لگاؤ، ان کی گردن میں مہریں ڈلواؤ۔ اگر ان کے بال ماتھے پر لٹکیں تو انہیں کٹوا دو، وہ کپڑوں کے اوپر کمر کے گرد ڈوری باندھیں اور زین پر ایک طرف پیر گرا کر سواری کریں اور مسلمانوں کی طرح زین کے دونوں طرف پیر لٹکا کر سوار نہ ہوں۔ کنیز العمال ۲/۲۹۶
(حضرت عمر کے سرکاری خطوط ص ۲۹۷)

سواد (عراق کے دیہات) کا ایک ذمی شراب کی تجارت سے خوب مالدار ہو گیا۔ اس کی شکایت عمر فاروق سے کی گئی تو انہوں نے (مسلمانوں کے نام لکھا :
اس کی جو چیز تمہارے ہاتھ آئے توڑ ڈالو۔ اس کے سارے جانور ہانک کر لے جاؤ اور کوئی مسلمان اس کی امانت اپنے گھر نہ رکھے۔
(حضرت عمر کے سرکاری خطوط ص ۲۹۸)

کوفہ کے گورنر کے نام لکھتے ہیں۔
" مسلمان قاتل کو مقتول ذمی کے ورثا کے حوالہ کر دو چاہیں وہ اسے قتل کر دیں اور چاہیں معاف کر دیں۔"
یہ خط گورنر کو موصول ہوا تو ایک وفد کوفہ سے خلیفہ کے پاس آیا اور اس نے سفارش کی چونکہ قاتل ایک ممتاز غازی ہے اسے قتل کی سزا نہ دی جائے بلکہ اس سے مقتول ذمی کا خون بہا دلوا دیا جائے
عمرؓ نے گورنر کو لکھا۔
" خزانہ سے خون بہا دے کر قاتل کی جان بچا لو" خوارزمی

جامع مسانید ابی حنیفہ، حیدر آباد ہند ۱/۱۷۷
(حضرت عمر کے سرکاری خطوط صہ ۳۰۸)

مولانا شبلی نعمانی نے "الفاروق" میں اپنا زورِ قلم اس بات پر توصرف کیا ہے کہ حضرت عمر نے ذمیوں کے مالی، جانی اور مذہبی حقوق کا اچھی طرح سے تحفظ کیا۔ مگر مولانا موصوف کو اس کا احساس نہیں ہوا کہ اگر کسی قوم کی عزتِ نفس پر ٹھوکریں مارنے کا انتظام کیا جائے تو وہ سب سے زیادہ تکلیف دہ اور انسانیت سوز بات ہوتی ہے۔ آپ نے اپنے مخصوص انداز سے، ذمیوں پر بعض مذہبی نوعیت کی اور مخصوص لباس پہننے کی پابندیوں کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت عمر کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے جو کمر کے گرد ڈوری باندھنے کا حکم دیا تھا تو دراصل وہ زنار تھی کہ جو وہ ہمیشہ سے باندھا کرتے تھے۔ ہم اس بحث میں پڑے بغیر کہ کمر میں پٹکا یا ڈوری باندھنا خود ان کا قومی شعار تھا یا نہیں، صرف اتنا دریافت کریں گے کہ کیا یہ گھوڑے سواری کا ذلت آمیز طریقہ بھی کہ جس پر ذمیوں کو مجبور کیا گیا ان کا قومی شعار تھا۔ خود مولانا موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ ذمیوں کے لئے حکم تھا کہ وہ زین کسنے کے بجائے گھوڑے پر کاٹھی کسا کریں۔ شاید ان کے نزدیک یہ ذلت کا سامان نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کی کوئی صفائی نہیں پیش کی۔ اور گلے میں مہریں ڈالنے والی بات اڑا گئے کہ واضح طور پر ذلت کی علامت تھی۔

کسی ذمی کی دولت لوٹنے کا حق مسلمانوں کو دے دینا نادر شاہی حکم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اگر اس کی دولت

شریعت کے کسی قانون کی رو سے ناجائز تھی تو حکومت باقاعدہ مقدمہ چلا کر اسے ضبط کر لیتی۔ مگر حضرت عمرؓ نے مذکورہ بالا حکم دیکر تہذیب و تمدن کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔

کسی ذمی کے قاتل کو محض اس لئے قانون کے مطابق سزا نہ دینا کہ وہ ایک بہت بڑا غازی ہے اور اس کی سفارش کے لئے مسلمانوں کا ایک وفد آیا ہے۔ عدلِ فاروقی کا عجیب و غریب نمونہ ہے

ہم سمجھتے ہیں کہ اب قارئین اچھی طرح سے اندازہ لگا سکیں گے کہ نائب رسولؐ کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کا معیارِ حکمرانی کیا تھا۔

بحیثیت دنیاوی حکمران:

دنیاوی حکمران کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کامیاب ترین حکمران تھے۔ یہاں حکمران سے مراد ایک خود مختار اور مطلق العنان حکمران ہے جیسا کہ اس دور کا تقاضے تھا۔ اور کامیابی سے مراد بھی وہی کامیابی ہے کہ جس کی بنیاد پر ایک خود مختار اور مطلق العنان حکمران کو کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی اس نے بڑی بڑی فتوحات کی ہوں اور اندرون ملک امن و امان قائم رکھا ہو۔ اور اگر رعایا خوشحال ہو اور عدل انصاف بھی ہو تو پھر ایسے حکمران کا کیا کہنا۔ مگر یہاں یہ دیکھنا ضروری نہیں ہوتا کہ اگر فتوحات کی گئیں تو وہ کس اخلاقی یا قانونی جواز کے تحت کی گئیں اور یہ کیونکر ممکن ہوئیں۔ اور ان میں اخلاقی اقدار کو کس حد تک ملحوظ رکھا گیا۔ اگر ملک میں امن برقرار رہا اور کسی صوبہ کے گورنر نے بغاوت نہیں کی تو ایسا کیسے ممکن ہوا۔ اگر رعایا خوشحال ہو گئی تو کیسے۔ اور

خوشحالی عوامی تھی یا کسی خاص طبقہ تک محدود تھی اور اگر عدل و انصاف تھا تو اس کا معیار کیا تھا۔

حضرت عمرؓ کے دور میں بڑی بڑی فتوحات بھی ہوئیں اور اندرون ملک بھی امن رہا کوئی بغاوت رونما نہیں ہوئی۔ خوشحالی بھی تھی اور عدل و انصاف کا چرچا بھی۔ اب ہم انہی کامیابیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بات کا جائزہ لیں گے کہ یہ کامیابیاں حضرت عمرؓ کی ذاتی صلاحیتوں کی کس حد تک مرہونِ منت ہیں۔

فتوحات :

حضرت عمرؓ کے دور کی فتوحات کا اصل راز یہ ہے کہ وہ قبائل کہ جو بنیادی طور سے جنگجو تھے اور اکثر بے مقصد لڑائیاں لڑتے اور بعض تو لوٹ مار میں مصروف رہتے۔ ایسے لوگوں کو زندگی گذارنے کے واضح مقاصد بتا دیئے گئے تھے۔ مگر رسول اللہؐ کی وفات کے بعد جہاد جیسے اہم اور نازک فریضہ کو اس کی اصل روح سے ہٹا دیا گیا عربوں کی وہ بھیڑ جو رسول اللہؐ کے ہمراہ جہاد میں شریک نہیں ہوئی تھی اور مرکز مدینہ سے دوری کے سبب اصل اسلامی تعلیمات سے پوری طرح واقف نہیں تھی اس نے جہاد کے غلط اور انتہائی پرکشش تصور کو سرمایہ حیات بنا لیا۔ ان کے ذہنوں میں یہ چیز بٹھا دی گئی تھی کہ یہ تمہارا دینی فریضہ ہے کہ تم کفار و مشرکین کے ملکوں میں جاؤ۔ ان کے سامنے اسلام کو پیش کرو اگر وہ قبول نہ کریں تو جزیے کے طالب ہو اور اگر یہ بات بھی نہ مانیں تو ان سے جنگ کرو۔ اور اس جنگ میں تمہارا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ قتل ہو گئے تو جنت کی ایسی پرکشش

زندگی کا جس کا تم تصور نہیں کر سکتے اور زندہ رہے تو عیش کے وہ سامان کہ جس کے بارے میں تم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ انسان کو جان صرف اس لئے پیاری ہوتی ہے کہ وہ زندگی کی لذتیں چھوڑنا نہیں چاہتا عربوں کی لذت عورت اور شراب میں تھی۔ شراب حرام ہوگئی تو اس لذت سے محروم ہوگئے۔ مگر جنت میں شراب طہورہ کے وعدے کئے گئے — اور حوروں کی شکل میں عورتوں کے بھی، چنانچہ جنت کی خواہش دلوں میں اتنی شدید کہ جب لڑتے تو ٹوٹ کر لڑتے کہ مرنا جینا دونوں برابر ہے، آیتوں کی تلاوت اور خطیبوں کی شعلہ بیانی اُن کی آتشِ شوق کو ایسا بھڑکاتی کہ وہ جنت میں جانے کے لئے بے قرار ہو جاتے۔ حضرت عمر کی فتوحات کا اصل راز یہی ہے۔

خود حضرت عمرؓ کی طبیعت میں وہ اولوالعزمی اور مہم جوئی نہ تھی کہ جو بڑے بڑے فاتحین کا خاصہ رہی ہے۔ آپ نے تو بس اتنا کیا کہ مہم جو جنگ بازوں کو جنگ کی اجازت دے دی اور یہ وہ لوگ تھے کہ جو ابوبکرؓ کے زمانے ہی سے عراق و شام میں قتل و غارتگری کا بازار گرم کئے ہوئے تھے۔ خود حضرت عمر نے کسی نئے علاقہ کو فتح کرنے کا عزم نہیں کیا اور نہ کبھی میدانِ جنگ میں نظر آئے۔ عمرو العاص نے نئی فوجی مہم یعنی مصر کی فتح کی اجازت مانگی تو بڑی مشکل سے مشروط اجازت دی اور دل میں ڈرتے رہے۔ پھر عمرو بن العاص کے لشکر کو راستہ ہی سے واپس بلوایا۔ یہ عمرو العاص کے حوصلے کی بات تھی کہ وہ حضرت عمر سے چال چل گئے اور واپس نہ آئے تو مصر فتح ہوگیا۔

یہ وہ صورت حال ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم حضرت

عمر کو کس طرح سے دنیا کا سب سے بڑا فاتح لکھیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آپ کی انتظامی صلاحیتوں اور مرکز میں بیٹھ کر جنگی امور سے اچھی واقفیت (جبکہ اسی زمانہ میں کمیونیکشن کی سہولتوں کا فقدان تھا) کا ان فتوحات میں کافی دخل ہے۔

داخلی امن :

حضرت عمر کے پورے دورِ حکومت میں کوئی بدامنی کا واقعہ نہیں ہوا اور نہ ہی کسی صوبے کے گورنر نے بغاوت کی۔ اس طرح سے اس دورِ حکومت کو بے مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کی کیا وجوہات تھیں، اصل مسئلہ تو یہ ہے! بس یہ حضرت عمر کی وہ ذاتی صلاحتیں تھیں کہ جو ایک اعلیٰ ترین حکمرانوں میں ہو سکتی تھیں۔ مگر یہ وہ حکمران ہوتا ہے کہ جس کے پیشِ نظر کوئی اصول یا قانون نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف مصلحت کے تقاضے ہوتے ہیں۔ حضرت عمر خود ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ رعایا کو کس طرح قابو میں رکھتے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"خدا کی قسم! میں پیٹ بھر کر کھاتا ہوں اور سیراب ہو کر پیتا ہوں۔

میں لوگوں کو دھمکاتا بھی ہوں اپنی عزت کی مدافعت بھی کرتا ہوں کبھی لوگوں کو ہاتھ سے ہٹاتا ہوں۔ کبھی مارتا ہوں اور کبھی عصا بھی نکالتا ہوں اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں معذور سمجھا جاتا۔ جب معاویہ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا۔ خدا کی قسم! حضرت عمر اپنی رعایا سے بخوبی واقف تھے۔

(تاریخ طبری حصہ سوم صد ۱۷۳

حضرت عمر نے ہمیشہ مصلحتوں سے کام لیا۔ جب تخت خلافت پر جلوہ افروز ہوئے تو خالد بن ولید کو صرف سالاری سے معزول کیا حالانکہ ابوبکرؓ کے دور میں آپ خالد کو زانی اور قاتل سمجھتے رہے۔ ایک بڑے غازی کو قتل کی سزا سے بچانے کے لئے کوفہ کے معززین نے زور ڈالا تو سزائے موت کو بدل کر دیت دلوادی وہ بھی بیت المال سے۔ مغیرہؓ بن شعبہ کو ام جمیل سے زنا کے جرم میں شک کا فائدہ دیکر چھوڑ دیا۔ حالانکہ حضرت علی کے نزدیک اس فائدے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ شام میں امیر معاویہ کی حکومت کو دوام بخشنے والے حضرت عمر ہی تھے۔ اور اس طرح سے خلافت بنوامیہ کے اصل بانی حضرت عمر ہی ہوئے۔ آپ امیر معاویہ کے رنگ ڈھنگ دیکھتے مگر خاموش رہتے امیر معاویہ نے حضرت عمر کی زندگی ہی میں شام کے گورنر کی حیثیت سے شاہانہ زندگی گزارنا شروع کر دی تھی۔ مگر مصلحت اسی میں تھی کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ بصرے کی کسی امیر خاتون کے گھر میں پڑے ہوئے ریشمی پردے پھڑوا دینا اور کسی چھوٹے موٹے گورنر کے بالاخانہ کو گروا دینا آسان کام تھا لہذا ہو گیا اور آنے والی نسلوں پر عمرؓ کی سادگی اور مساوات کی دھاک بیٹھ گئی۔

دراصل حضرت عمرؓ اس شخص سے درگزر کرتے اور دشمنی مول نہ لیتے کہ جس سے فتنہ کا خدشہ ہوتا۔ خاص طور سے یہ تین افراد ایسے تھے کہ جو اپنی چالاکیوں کے لئے مشہور تھے اور یہ بات طے شدہ ہے شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ اس وقت عرب میں تین شخص تھے جو مشہور مدبر اور صاحب ادعا تھے۔ امیر معاویہ، عمرو بن العاص۔ مغیرہ بن شعبہ چونکہ مہمات ملکی کے انجام دینے کے لئے ان لوگوں سے بڑھ کر تمام عرب

میں کوئی شخص ہاتھ نہیں آسکتا تھا اس لئے سب کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔ (الفاروق صہ ۴۳۳)

غرضیکہ عمرؓ نے با اثر لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لئے رعائتیں دیں اور درگزر کی پالیسی کو اپنایا۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ دانشمندانہ پالیسی اختیار کی کہ بنو ہاشم اور بعض بڑے صحابہ کو مدینہ سے باہر نہ جانے دیا۔ اور صحابہ میں سے صرف ان حضرات کو جہاد کی اجازت دی کہ جن پر پورا اعتماد تھا۔ صوبوں کے والی بناتے وقت بڑے صحابہ کو عموماً نظر انداز کر دیتے تھے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:

یہ واقعہ ہے کہ حضرت عمر کو اس بات کا ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں آنحضرت کے برگزیدہ اصحاب کسی آزمائش میں نہ مبتلا ہو جائیں یا خود عوام کو آزمائش میں مبتلا نہ کر دیں۔ اسی وجہ سے آپ ان بزرگوں کو ولائتیں نہ سونپتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت سعد اور حضرت ابوعبیدہؓ کو جنہیں علی الترتیب ایران اور شام کی مہمات جنگی کی قیادتیں عطا ہوئیں مستثنیٰ کہا جا سکتا ہے۔

حد یہ ہے کہ حضرت عمر یہ تک پسند نہ کرتے تھے کہ یہ بزرگ مدینہ سے باہر نکلیں اور یہ محض اس لئے کہ آپ کو یہ خوف تھا کہ کہیں ان کی ذات کو کسی فتنہ کا مرکز نہ بنا دیا جائے.........

بعض اکابر صحابہ حضرت عمر سے جہاد میں شرکت کی اجازت مانگا کرتے تھے آپ ایسے حضرات کو یہ کہہ کر منع فرما دیا کرتے تھے کہ آنحضرت کے ساتھ شریک جہاد ہو چکنے کے بعد انہیں جزا مل ہی جائیں گی اور اب یہ کام دوسروں کا ہے کہ جہاد میں شریک ہوں۔"

(اردو ترجمہ الشیخان صہ ۲۲۹)

" جو لوگ سب سے زیادہ با اثر تھے ان کو اکثر دارالخلافہ سے باہر نہیں جانے دیتے .... ایک دفعہ عبدالرحمن بن عوف (جو کہ عشرہ مبشرہ کے صحابی تھے) نے پوچھا آپ ہم لوگوں کو باہر جانے سے کیوں روکتے ہیں۔ فرمایا اس سوال کا جواب نہ دینا جواب دینے سے بہتر ہے۔ .... بنو ہاشم کو کبھی ملکی عہدے نہیں دیئے۔

(الفاروق صہ ۴۳۳)

یہ تھی وہ صورتحال کہ جس کی بناء پر حضرت عمر داخلی امن قائم رکھ سکے۔ مگر قیام امن کے لئے حضرت عمرؓ کا یہ انداز عام دنیاوی سیاست میں بھی قابلِ تحسین نہیں ہو سکتا کہ آپ کے بہت سے اقدامات موجودہ جمہوری اصولوں کے خلاف تھے۔ ایک عام اصول پرست انسان کے ہاں بھی ان باتوں کی گنجائش نہیں، یہاں تو معاملہ نائب رسول کا تھا۔

خوشحالی

حضرت عمر کے دور حکومت کی خوشحالی اور دولت مندی کے بڑے چرچے ہیں۔ اس میں تو کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ مدینہ میں دولت کے انبار لگ گئے تھے۔ مگر یہ دولت کثرت سے ہونے والی فتوحات کا نتیجہ تھی۔ اس کے لئے حضرت عمر نے کوئی پنج سالہ منصوبہ نہیں بنایا تھا کہ جس پر انہیں داد دی جائے۔ ان کا تو کمال یہ تھا کہ اس دولت کی منصفانہ تقسیم کرتے اور زیادہ سے زیادہ معاشی مساوات قائم کرنے کی کوشش کرتے۔ جبکہ ہوا یہ کہ رسول اللہ کی وفات کے چند ہی برس بعد عالم اسلام اور خاص کر مدینہ میں ایک

بڑا جاگیردار طبقہ پیدا ہو گیا۔ اتنی دولت کے باوجود سخت معاشی ناہمواری موجود تھی۔ عین مدینہ کا یہ عالم تھا کہ وہاں کبھی کبھار گشت کے دوران خود حضرت عمر کو بھوک سے بلبلاتے بچوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ تو پھر دور دراز کی رعایا کے بارے کیا کہا جا سکتا ہے کہ روز کتنے بچے بھوکے سوتے ہوں گے۔

مسلمانوں میں سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ حضرت عمرؓ ہی کا پیدا کیا ہوا تھا جناب شبلی نعمانی فرماتے ہیں۔

ان تمام زمینوں کو حضرت عمرؓ نے خالصہ قرار دے کر ان کی آمدنی جس کی تعداد ستر لاکھ تھی رفاہ عام کے کاموں کے لئے مخصوص کر دی کبھی کبھی کسی شخص کی اسلامی کوششوں کے صلہ میں جاگیر عطا کی جاتی تھی تو انہی زمینوں سے کی جاتی تھی۔

(الفاروق)

ڈاکٹر خورشید احمد فارق فرماتے ہیں۔

ان فوجوں کا خرچہ نکالنے کے بعد عمر فاروق کے خزانہ میں بہت سا روپیہ بچ رہتا تھا جس کا کچھ حصہ وہ مدینہ کے باشندوں میں بانٹ دیتے تھے لیکن آمدنی اس تیزی اور اتنے بڑے پیمانے پر بڑھتی جا رہی تھی کہ اس کا کوئی مستقل اور باضابطہ مصرف نکالنے کی ضرورت تھی۔ عمر فاروق نے اس امنڈتی ہوئی دولت کو ٹھکانے لگانے کا جو نظام قائم کیا وہ دیوانِ عطا کے نام سے مشہور ہے۔ اس ادارہ کے ماتحت ان مسلمانوں کی سالانہ تنخواہ اور خوراک کے لئے ماہانہ راشن مقرر کر دیا گیا جنہوں نے ہجرت کے بعد سے اب تک ایک بار یا زیادہ جہاد کیا تھا۔"

(حضرت عمر فاروق کے سرکاری خطوط صہ ۳۷)

تاریخ طبری میں ہے کہ :

سائب ابن یزید کہتے ہیں۔ میں نے حضرت عمر بن الخطاب کو یہ فرماتے سنا۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہر ایک کا اس بیت المال میں حق ہے اور اس معاملہ میں کسی کو دوسرے پر ترجیح حاصل نہیں ہے بلکہ میں بھی ایک معمولی فرد ہوں۔ البتہ ہمیں کتاب اللہ اور رسول اللہ صلعم کی تقسیم کے مطابق چلنا ہوگا۔ نیز ہر ایک کے اسلامی کارناموں۔ اس کی دولت مندی اور ضرورت اور قدیم اسلام لانے کے تعلقات کا لحاظ کرنا ہوگا۔ (طبری حصہ سوم صد ۲۶۳)

اس امتیازی تقسیم کی وجہ سے خوشحالی صرف ایک محدود طبقہ تک تھی۔ خاص طور سے یہ لحاظ والا طبقہ بڑا دولتمند تھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبداللہ، زبیر بن العوام کا تعلق اسی مرعات یافتہ طبقہ سے تھا۔

عدل وانصاف

عدل فاروق، عدل جہانگیر کی طرح مشہور ہے۔ مگر نہ آمرانہ مزاج سے صحیح عدل ہو سکتا اور نہ شاہانہ جاہ وجلال سے۔ ان دونوں کے ہاں کیفیات یا موڈ کی بات ہوتی ہے۔ یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی تو آمرانہ مزاج کسی حسین مرد کو محض اس وجہ سے شہر بدر کر دیتا ہے کہ وہ اتنا حسین کیوں ہے اور کبھی کسی صحابی کے بیٹے پر اتنا مہربان کہ اس کی محبوبہ کو اس سے ملانے کی سبیل نکالتا ہے۔ کبھی حدود اللہ کے قیام میں اتنا سخت کہ اپنے بیٹے کو حد مارنے میں حد سے بڑھ جاتا ہے اور کبھی غیر کو معاف کر دیتا ہے اور یہی ادا شاہانہ جاہ وجلال کی ہے۔ نور جہاں پر عاشق ہوئے تو اس

کے شوہر کو مروا کر اس سے شادی کرلی اور پھر ایک دھوبی کے قتل پر اسی نور جہاں کو مارنے پر تیار ہو گئے اور پھر بات "خوں بہا" پر ختم ہوگئی۔ گدی سے زبان کھینچنے کا محاورہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ مگر عادل جہانگیر صاحب نے عدل جہانگیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قاضی نور اللہ شوستری جیسے عالم دین کی زبان گدی سے کھچوائی تھی۔

قاضی عدالتیں قائم کر دینے سے بات نہیں بنتی چاہے وہ ہر ضلع میں ہوں یا ہر محلہ میں اور نہ ہی قاضیوں کو چند ہدایت نامے اور نصیحت نامے بھیجنا کافی سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر یہاں یہ عالم ہے کہ قاضی عدالتوں کا قیام، حضرت عمرؓ کے چند ہدایت نامے اور نصیحت نامے، قاضیوں کے فیصلوں کی چند حکایتیں ہی ہیں (جن سے اسلامی عدل مساوات کی شان ٹپکتی ہے) جنہیں فاروقی عہد کا سرمایہ عدل و انصاف سمجھا جاتا ہے اور اسی کی بنیاد پر اس عہد کے عدل و انصاف کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے تو "عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی" کی جدید اصطلاح استعمال کر کے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد فاروقی میں جدید دور کے مطابق عدل و انصاف کے اعلیٰ و ارفع تصورات موجود تھے اور جن پر باقاعدگی اس عمل ہوتا تھا۔ اور یہ محض اس لئے کہا گیا کہ ایسی کچھ مثالیں موجود ہیں کہ رعایا کی طرف سے بعض عمال کے خلاف قاضی کی عدالت میں فریاد کی گئی اور فریاد سنی گئی اور دو ایک مثالیں خلیفہ وقت عمرؓ کے سلسلہ میں ہیں، مگر ان کے بارے میں خود شبلی نعمانی نے یہ لکھ دیا کہ محض قاضی کو آزمانے کے لئے وہ عدالت میں پیش ہوتے تھے۔ مگر مستقل صورت حال تو یہ تھی کہ صوبہ کا والی جو کہ انتظامیہ کا فرد تھا۔ وہ قاضی کی حیثیت سے مقدمات کا فیصلہ بھی کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ کا تعلق انتظامیہ کے سب سے بڑے عہدے سے تھا۔ اور

وہ مقدمات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور آپ نے بعض ایسے فیصلے بھی کئے کہ جن پر بعض بڑی منزلت والے صحابہ معترض ہوئے۔ مگر ایسی کوئی عدالت نہیں تھی کہ جس میں حضرت عمر کے غلط فیصلوں کے خلاف اپیل کی جا سکتی اس سلسلہ میں مغیرہ بن شعبہ کی مثال کافی سمجھی جا سکتی ہے۔

والیوں کے سرکاری احکامات اور پالیسیوں کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کی شکایت خلیفہ سے کی جا سکتی تھی۔ مگر خود خلیفہ کی پالیسیوں اور احکامات کو کہیں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا جبکہ آپ نے بعض ایسے احکامات صادر کئے اور وہ پالیسیاں اختیار کیں کہ جنہیں صائب الرائے صحابہ نے خلاف شرع قرار دیا۔

اتنی واضح صورت حال کی روشنی میں مولانا شبلی کا فاروق اعظم کے عدالتی نظام کو مہذب دنیا کے عدالتی نظام سے بہتر قرار دیا۔ دلوانے کی بڑ سے زیادہ نہیں۔

عام عدل و انصاف کا عالم یہ تھا کہ "حضرت عمر شام سے واپس آرہے تھے تو چند آدمیوں کو دیکھا کہ دھوپ میں کھڑے ہیں اور ان کے سر پر تیل ڈالا جا رہا ہے۔ لوگوں سے یہ پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے! معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے جزیہ نہیں ادا کیا۔ اس لئے ان کو سزا دی جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ آخر ان کا عذر کیا۔؟ لوگوں نے کہا ناداری فرمایا کہ چھوڑ دو اور ان کو تکلیف نہ دو۔

(الفاروق صہ ۳۹۶)

اسی طرح کی اور بھی مثالیں ہیں کہ جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعض جرائم کے لئے کوئی واضح قانون موجود نہیں تھا۔ اور اس مثال سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بعض صورتوں

میں مجرموں کو باضابطہ طور سے عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزا انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص نے اپنی ذاتی رائے کے مطابق دی تھی۔ قرآن وسنّت میں کسی ایسی سزا کی گنجائش نہیں ہے۔

انسانوں کو اس طرح سے عقوبت کا نشانہ بنتے دیکھ کر حضرت عمرؓ کا ظالموں کو محض نصیحت کرنا اور وقتی طور سے انہیں سزا سے بچا لینا شبلی نعمانی کو عدل فاروقی کا ایسا نمونہ نظر آیا کہ اس کا تذکرہ کر دیا۔ حالانکہ قابل تعریف بات جب ہوتی کہ آپ اس ظلم و زیادتی کی باقاعدہ تحقیق کرتے۔ اور اصل مجرم کو سزا دیتے۔ حضرت عمرؓ کا اس واقعہ کو زیادہ اہمیت نہ دینا اس بات کی علامت ہے کہ اس قسم کے واقعات کا ہونا اس دور میں ایک معمولی بات ہی ہو گی جیسا کہ آزادی ہند و پاک سے پہلے ہمارے ہاں ہوتا تھا کہ معمولی معمولی باتوں پر ظالم جاگیردار غریب کسان کی یہ گت بناتے تھے۔

عمرؓ اور جمہوریت

جمہوریت کی معروف اور تسلیم شدہ تعریف یہ ہے کہ "عوام کی حکومت عوام کے ذریعہ، عوام کے لئے".... عوام کی حکومت کی اسلامی فلسفۂ حکومت میں کوئی گنجائش نہیں ۔ کیونکہ وہاں اقتدار اللہ تعالیٰ کے پاس ہوتا، عوام کے پاس نہیں۔ البتہ عوام کے ذریعہ اور عوام کے لئے والی بات کو بنیاد بنا کر حضرت عمرؓ کا جمہوریت سے کوئی تعلق تلاش کیا جا سکتا ہے۔

نہ تو خود حضرت عمر کو عوام نے منتخب کیا، اور نہ آپ کے پاس کوئی ایسی مجلس شوریٰ تھی کہ جسے عوام نے منتخب کیا ہو۔ آپ کو حضرت ابوبکرؓ نے اپنے وقت آخر نامزد کر دیا تھا۔ اور پھر ابوبکرؓ کی وفات کے بعد مدینہ کے بعض نمائندہ صحابہ نے قہراً جبراً اور بعض نے ہنسی خوشی حضرت عمرؓ کی بیعت کر لی اور پھر عام بیعت ہو گئی۔ مدینہ میں عام بیعت کا مطلب یہ تھا کہ خلیفہ کو پورے عالم اسلام نے قبول کر لیا۔ اگر اسے جمہوری طریقہ انتخاب قرار دیا جائے تو یقیناً بڑی زیادتی ہوگی۔

نہ تو حضرت عمر کا انتخاب عوام کے ذریعہ ہوا اور نہ ہی آپ نے عوام کے ذریعہ حکومت چلائی۔ عوام کے ذریعہ حکومت چلانے سے مُراد جمہوریت میں یہی لی جاتی ہے کہ عوام کا منتخب نمائندہ عوام کے منتخب نمائندوں کے تعاون سے کاربارِ حکومت چلاتا ہو۔ ہر قانون عوامی

نمائندوں کی کثرت رائے سے بنتا ہو، مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر کی کوئی منتخب مجلس شوریٰ نہیں تھی۔ اگر کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ صاحب الرائے صحابہ کو جمع فرماتے اور ان سے رائے لیتے مگر یہ ضروری نہ تھا کہ آپ ان کی رائے پر عمل بھی کریں۔ بعض اوقات کوئی دینی مسئلہ آپ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا تو آپ حضرت علی یا اور کسی صاحب الرائے صحابی سے دریافت کر لیتے یا کبھی صحابہ کی پوری مجلس میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوتی۔

حضرت عمر نے ایسے بہت سے احکامات جاری کئے کہ جو بالکل نئے تھے اور ان میں سے بعض تو قول و فعلِ رسول و ابوبکر کے خلاف تھے آپ کی یہ نئی باتیں اولیات عمر کہلاتی ہیں۔ ان کی تعداد شبلی نعمانی نے ۴۵ بتائی ہے۔ مگر کہیں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے ان باتوں کی اپنی مجلس شوریٰ سے منظوری لی ہو۔ ان میں سے بعض امور تو ایسے تھے کہ جن کی منظوری جمہوری اصولوں کے تحت واجب تھی اور وہ امور یہ تھے۔ ۱: نئے محصولات ۲۔ اذان میں اضافہ ۳۔ تین طلاقوں کا مسئلہ ۴۔ شراب کی حد میں اضافہ ۵۔ گھوڑوں پر زکوٰۃ ۶۔ بنو تغلب کے عیسائیوں پر زکوٰۃ لازم قرار دینا ۷۔ نماز جنازہ میں چار تکبیریں ۸۔ بیت المال کا قیام ۹۔ امیر المومنین کا لقب اختیار کرنا ۱۰۔ مفتوحہ ممالک کی زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم کر دینے کے بجائے سرکاری تحویل میں لے لینا ۱۱۔ مستقل فوج اور چھاؤنیوں کا قیام ۱۲۔ عربوں کو غلامی سے مستثنیٰ قرار دینا۔ خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں۔ ۱۳۔ ایسے منصوبے کہ جن پر کثیر رقم صرف ہوتی ہو۔

حضرت عمر کا سب سے زیادہ جمہوریت کش اقدام خلیفہ ثالث کے انتخاب کے لئے ایک پراسرار مجلس شوریٰ کا قیام تھا۔ آپ نے کامل مطلق العنانی سے کام لیتے ہوئے ایک ایسی مجلس شوریٰ قائم کی کہ ہر صورت میں آپ کا من پسند امیدوار خلیفہ بن جائے اور اس مجلس کا طریقہ کار کتنا عجیب وغریب اور جمہوری اصولوں سے کوسوں دور تھا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ سیاست میں یہی ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ نائب رسول کی سیاست کچھ اور ہوتی ہے۔ اس میں یہ نہیں ہوتا روشن ضمیر لوگ جانتے ہیں کہ ایک شخص نیابت رسول کا حق ادا کر گیا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس کتاب میں اس کا تذکرہ آئے مگر اس مجبوری کا کیا کیا جائے کہ اگر حق کا اعلیٰ ترین معیار پیش کرنا ہو تو مثال کے لئے اس شخص کے علاوہ کوئی نہیں ملتا۔ اس نے کٹھن سے کٹھن موقع پر بھی اسلامی اصولوں سے سرمو انحراف نہیں کیا۔

ابوطالب کے بیٹے پر کائنات کا ذرہ ذرہ نثار کہ اس نے طلحہ و زبیر کو مکہ جانے کی اجازت دے دی۔ اگر وہ سیاست میں عمر کی پیروی کرتے ہوئے انہیں مدینہ سے باہر نہ جانے دیتا تو شاید جنگ جمل نہ ہوتی۔ یہ دونوں خدمت علی ابن ابی طالب میں حاضر ہو کر کہتے ہیں کہ مکہ کا قصد ہے اور مقصد زیارت۔ اجازت دیجئے۔ جواب ملتا ہے۔ نہیں! فتنہ پھیلانے جا رہے ہو۔ مگر تم آزاد ہو جہاں جی چاہے جاؤ۔ لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ معاویہ کو معزول نہ کیجئے۔ بغاوت کرے گا۔ جواب ملتا ہے۔ ایسے غلط آدمی کو اپنا گورنر رہنے دوں۔ میں تو اسے ایک دن بھی برداشت نہیں کروں گا اور پھر جو کچھ ہوا سب جانتے ہیں۔ اگر آپ سیرت عمر پر عمل کرتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ ایک وقت وہ آیا کہ

آپ لوگوں سے کہتے کہ جنگ کے لئے نکلو۔ مگر وہ بہانے کرتے۔ آپ لاکھ غیرت دلاتے مگر کچھ اثر نہ ہوتا۔ جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ بیچارے جنگ کرتے مگر مال غنیمت سے محروم۔ علی فرماتے کہ جن سے جنگ کر رہے ہو وہ گمراہ ہیں مگر کلمہ گو ہیں۔ ان کا مال لوٹنے کی کیسے اجازت دوں۔ آپ نے اسلامی اصولوں کی خاطر یہ نہیں سوچا کہ بدظن ہو جائیں گے اگر سوچا تو یہی کہ ٹھیک ہے۔ میں اپنے مخلص شیعوں کو لے کر نکلوں گا۔ چاہے ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو۔ اگر کوئی نہ ملا تو ظلم کے خلاف تنہا جنگ کروں گا۔ مگر زندگی نے وفا نہ کی، شاید کربلا کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔

حضرت عمرؓ کے فضائل

شیطان کا دور بھاگنا

قال رسول اللہ یا بن الخطاب والذی نفسی بیدہ
ما لقیک الشیطان سالکا فجا قط الا سلک فجا غیر
فجک ، رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ اے خطاب کے بیٹے خدا کی قسم
تم کو شیطان جس راستہ سے جاتے ہوئے دیکھتا ہے اس کو چھوڑ کر
وہ دوسرے راستہ سے چلنے لگتا ہے۔

(صحیح بخاری جلد ۲ صہ ۲۰۱، مطبوعہ مصر ۱۳۵۵ھ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عمرؓ معصوم بھی تھے۔ شیطان دور
بھاگے تو پھر گناہ کا کیا سوال! مگر تعجب تو یہ ہوتا ہے کہ شیطان
ابوالبشر جناب آدم تک پہنچ ہی کامیاب ہوگیا۔ جناب عمر تو بہر حال
بشر تھے اور پھر اس نے تو خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ
علیہ وسلم کو بھی نہیں بخشا۔ حدیثوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ
آنحضرت سے بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ رسول اللہ کو دیکھ کر راستہ
بدلنا تو کجا وہ تو ان کے پاس پہنچ جایا کرتا تھا۔

حدیث شریف میں ہے کہ

عن النبی اللہ صلی صلوۃ فقال ان الشیطان عرض

لی فشد علی لیقطع الصلوٰۃ علی۔ جناب رسول خدا نے نماز پڑھنے کے بعد فرمایا کہ شیطان میرے پاس آیا اور اس نے میری نماز قطع کر دینے کے لئے مجھ پر حملہ کیا۔

(صحیح بخاری پارہ نمبر ۵ صہ ۶۳۰)

قال ابن عباس فی امنیتہ اذا حدث القی الشیطان فی حدیثہ فیبطل اللہ ما یلقی الشیطان ویحکم آیاتہ

ابن عباس کہتے ہیں جب رسول اللہ صلعم خدا کا کوئی حکم بیان کرتے تو شیطان اس میں اپنی بات بھی ڈال دیتا اور آنحضرت کی حدیث میں اپنا کلام بھی ملا دیتا تھا۔ تب خدا یہ کرتا کہ شیطان کی ملائی ہوئی باتوں کو باطل کر دیتا اور اپنی آیتوں کو محکم کر دیتا۔

(صحیح بخاری پارہ ۱۹ صہ ۲۵۶)

خود آپ کے پاس تو شیطان آجاتا تھا۔ مگر آپ حضرت عمرؓ سے مخاطب ہو کر یہ کہتے ہیں کہ شیطان تجھ سے دور بھاگتا ہے۔ اب یا تو حضرت عمرؓ رسول اللہ سے بھی بڑھ کر کوئی چیز تھے یا پھر یہ حدیث موضوع ہے اور ایک تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ نے حضرت عمرؓ سے یہ فقرہ محاورے کے طور پر کہا ہو کہ جیسے ہمارے ہاں اردو زبان میں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص سے تو شیطان بھی پناہ مانگتا ہے یا شیطان بھی دور بھاگتا ہے۔

مگر مسلمان اسے موضوع حدیث نہیں سمجھتے اللہ اکثر و اعظم

حضرت عمرؓ کی شان بیان کرتے ہوئے اس حدیث کو بیان فرماتے ہیں۔ عمرؓ کی شان میں کچھ حدیثیں تو اس سے بھی بڑھ کر ہیں کہ اگر ان کی صحت پر یقین کر لیا جائے تو وحی الٰہی کی حقانیت سے انکار

کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی حدیثیں فضائل عمرؓ کی جان سمجھی جاتی ہیں اور واعظین انہیں بڑے زور و شور سے بیان کرتے ہیں۔ چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔

اذان

حدثنا عمران بن میسرۃ قال حدثنا عبدالوارث قال حدثنا خالد عن ابی قلابۃ عن انس قال ذکروا النار والناقوس فذکروا الیھود والنصاریٰ فامر بلال ان لشیع الاذان وان یوتیر الاقامہ۔" عمران بن میسرہ، عبدالوارث، خالد، ابوقلابہ، انس روایت کرتے ہیں کہ (نماز کے اعلان کے لئے) لوگوں نے آگ اور ناقوس بجانا تجویز کیا، پھر یہود و نصاریٰ کی طرف ذہن منتقل ہو گیا۔ (کہ یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں) تب بلال کو حکم دیا گیا کہ اذان کے کلمات دو دو مرتبہ کہیں اور اقامت کے ایک ایک مرتبہ۔"
(صحیح بخاری کتاب الاذان جلد ۱)

یہ بخاری شریف کی وہ حدیث ہے کہ جس میں کہیں حضرت عمرؓ کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی سلسلہ رواۃ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ایک اور حدیث اسی صفحہ پر موجود ہے اور اس میں بھی حضرت عمر کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اب ہم وہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ جس میں حضرت عمر کی رائے مذکور ہے۔

حدثنا محمود بن غیلان قال حدثنا عبدالرزاق قال اخبرنا ابن جریج قال اخبرنی نافع ان ابن عمر کان یقول کان المسلمون حین قدموا المدینۃ یجتمعون فیتحینون الصلوٰۃ لیس ینادی

لها فتكلموا يوماً في ذالك فقال بعضهم اتخذوا ناقوساً مثل ناقوس النصارىٰ وقال بعضهم بل بوقاً مثل قرن اليهود فقال عمر اولا تبعثون رجلا ينادي بالصلوٰة فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا بلال قم فناديا بالصلوٰة۔

محمود بن غیلان، عبدالرزاق، ابن جریج، نافع ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ مسلمان جب مدینہ آتے تھے تو نماز کے لئے نماز کے وقت کا اندازہ کر کے جمع ہوجاتے تھے۔ اس وقت تک نماز کا اعلان نہ ہوتا تھا۔ ایک دن مسلمانوں نے اس بارے میں گفتگو کی (کہ کوئی اعلان ضرور ہونا چاہیئے) بعض نے کہا کہ نصاریٰ کے ناقوس کی طرح ناقوس بنالو اور بعض نے کہا نہیں بلکہ یہود کی طرح کے سنکھ کی طرح ایک سنکھ بنالو، عمرؓ نے کہا کہ کیوں نہیں ایک آدمی کو مقرر کر دیتے کہ وہ الصلوٰۃ پکار دیا کرے۔ پس رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اٹھو اور نماز کی اطلاع کردو۔

(صحیح بخاری کتاب الاذان جلد ۱)

مسلمانوں نے ایسی حدیثوں کی موجودگی میں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اذان کا حکم خود رسول اللہ صلعم کی طرف سے تھا اس حدیث کا پروپیگنڈہ خوب کیا۔ جس میں حضرت عمر کا یہ فقرہ ہے کہ کیوں نہیں ایک آدمی کو مقرر کر دیتے کہ وہ الصلوٰۃ پکار دیا کرے" اور پروپیگنڈہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اذان کے کلمات کا تعین اور طریقہ وغیرہ سب حضرت عمر کی طرف سے ہے۔

اذان نماز کا دیباچہ خیال کی جاتی ہے اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی جاتی ہے۔

اللہ نے بذریعہ وحی نماز فرض کردی۔ رسول اللہ نے طریقہ کی وضاحت کرکے اسے مسلمانوں پر نافذ کردیا۔ مگر اس اہم فریضہ کی طرف بلانے کے سلسلے میں اللہ خاموش رہا اور رسول کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر حضرت عمرؓ، اللہ اور رسول سے بازی لے گئے۔ انہوں نے وہ راہ دکھائی کہ جس کی عظمت واضح ہے۔ نماز کی آواز کوئی نہیں سنتا اور اذان کی گونج دن میں پانچ وقت سارے عالم میں سنی جاتی ہے اور بقول لوگوں کے کسی روسی خلا نورد نے خلا میں اذان کی آواز سنی اور شاید مسلمان ہوگیا۔

مسلمانوں نے وہ روایت بڑے جوش و جذبے سے قبول کرلی جس میں حضرت عمر کے مشورے کا تذکرہ تھا اور اس پہلو کو نظر انداز کردیا کہ اس طرح تو مرتبۂ رسول سبک ہوجاتا ہے اور وحی الٰہی کی حقانیت کو بھی دھچکا پہنچتا ہے۔ شبلی نعمانی صاحب تو بہت ہی آگے بڑھ گئے۔ چلتے چلاتے ان کا اندازِ ستمگری بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"یہاں تک کہ نماز کے اعلان کا طریقہ بھی معین نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے آنحضرتؐ نے اس کا انتظام کرنا چاہا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں نماز کے اعلان کے لئے بوق اور ناقوس کا رواج تھا۔ اس لئے صحابہ نے یہی رائے دی۔ ابن ہشام نے روایت کی ہے کہ یہ خود رسول اللہ کی تجویز تھی۔ بہرحال یہ مسئلہ زیر بحث تھا اور کوئی رائے قرار نہیں پائی تھی کہ حضرت عمر آنکلے اور انہوں نے کہا کہ ایک آدمی اعلان کرنے کے لئے کیوں نہ مقرر کیا جائے۔ رسول اللہ صلعم نے اسی وقت حضرت بلال کو اذان کا حکم دیا۔"

(الفاروق)

شبلی صاحب حضرت عمر کی اس فضیلت کو اور روشن کر کے پیش کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ابن ہشام کی یہ روایت کہ بوس اور ناقوس والی تجویز خود رسول اللہ نے پیش کی تھی درج فرما دی اور رہی سہی کسر پوری کر دی۔

ذرا غور تو فرمایئے کہ اللہ کا رسول نماز کی طرف بلانے کے لئے بوق و ناقوس کی تجویز پیش کر رہا ہے۔ اور یہود و نصاریٰ کا طریقہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ مگر حضرت عمر کہتے ہیں کہ ایسا کوئی آدمی کیوں مقرر نہیں کر دیتے کہ جو نماز کا اعلان کر دیا کرے۔

منافق کی نمازِ جنازہ

یحییٰ بن کبیر، لیث، عقیل، ابن شہاب، عبید اللہ بن عبد اللہ ابن عباس، عمر بن خطاب سے روایت کرتے ہیں کہ جب عبد اللہ بن ابی بن سلول مرا تو اس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا گیا۔ تاکہ اس پر نماز پڑھیں۔ جب رسول اللہ صلعم کھڑے ہوئے تو میں آپ کی طرف بڑھا اور کہا۔ یا رسول اللہ کیا آپ عبد اللہ بن ابی پر نماز پڑھیں گے۔ حالانکہ اس نے فلاں فلاں دن اس طرح فلاں فلاں بات کہی تھی اور میں اس کی باتوں کو گنانے لگا۔ رسولؐ اللہ مسکرائے اور فرمایا کہ مجھ سے پیچھے بیٹھو۔ جب میں نے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اختیار دیا گیا، تو میں نے اختیار کیا۔ اگر میں جانتا کہ میں اس کے لئے ستر بار سے زیادہ دعائے مغفرت کروں تو وہ بخش دیا جائے گا۔ تو میں یقیناً اس سے زیادہ کرتا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز پڑھی، پھر واپس ہوئے اور تھوڑی دیر

بھی نہ ٹھہرنے پائے تھے کہ سورۃ براۃ کی دو آیتیں اتریں۔ ولا تصل علیٰ احد سے وھم فاسقون تک عمر نے بیان کیا کہ اس دن جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بات کی اس پر مجھے تعجب ہوا۔ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جاننے والے ہیں۔

(صحیح بخاری کتاب الجنایز پارہ ۵ صہ ۵۱۳)

اوپر کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے رسول اللہ کو نہ صرف ٹوکا بلکہ عبداللہ ابن ابی کی باتیں بھی یاد دلائیں۔ پھر رسول اللہ نے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ مگر وہ اپنی بات پر مصر رہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ نے تنگ آکر کہا کہ میں تو اس کی بخشش کے لئے ستر بار سے زیادہ دعائے مغفرت کرتا۔ بشرطیکہ بخشش کی امید ہوتی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس دور کی پابند نظم وضبط اسلامی تنظیمیں کہ جو اطاعت امیر پر بہت زیادہ زور دیتی ہیں۔ وہ اپنے امیر سے بھی اتنی تکرار کو پسند نہیں کریں گی۔ مگر مسلمانوں کو بارگاہِ رسالت میں حضرت عمر کا یہ گستاخانہ انداز پسند آیا اور کیوں نہ پسند آتا۔ اللہ نے بھی تو حضرت عمر کی اس ادا کو پسند فرمایا اور فوراً ان کی طرفداری میں آیت نازل کر دی۔

ہم مسلمانوں سے یہ دریافت کرنا چاہیں گے کہ رسول اللہ کے افعال واحکامات پر اگر کوئی امتی یہ کہتا رہتا ہو کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا یا یہ کہ آپ نے یہ حکم کیوں دیا۔ آپ کو یہ حکم نہیں دینا چاہیئے تھا اور پھر اللہ بھی اس امتی کا ساتھ دے اور اس کی رائے کے مطابق اپنے رسول کو تنبیہ کرے تو ایسے رسول کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔ مسلمان اس بات کا یہ جواب نہیں دے

سکتے کہ حدیثیں موجود ہیں ہم کیا کریں۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ لاکھوں کی تعداد میں حدیثیں وضع کی گئی ہیں۔ لہٰذا ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایسی حدیث کو مسترد کر دینا چاہیئے کہ جس میں توہین رسول کا کوئی پہلو نکلتا ہو اور یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ ایسی حدیثوں کی موجودگی میں کہ جنہیں قبول کر کے توہین رسول سے بچا جا سکتا ہے وہ حدیثیں قبول کی جاتی ہیں کہ جن سے توہین رسول ہو لیکن مگر فضیلت عمرؓ ثابت ہو۔ یہی صورت حال منافق کی نماز جنازہ کے بارے میں بھی پیش آئی ہے۔

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلعم عبداللہ بن ابی کے فرزند کہ جو مومن صادق تھا کی دلجوئی کی خاطر عبداللہ بن ابی کے جنازے میں شریک ہوئے مگر نماز نہیں پڑھائی۔ آپ سمجھتے تھے کہ اس فعل سے باقی منافقین کے قلوب کی تالیف ہو گی۔ چنانچہ بعض روایات کے مطابق ایسا ہی ہوا۔ ایک اور روایت کے مطابق آپ دلجوئی کی خاطر تشریف تو لے گئے مگر نماز پڑھانے سے پہلے ہی لا تصلی والی آیت نازل ہو گئی ہے۔

اگر بخاری کی زیر بحث حدیث ہی کو قبول کرنا ہے تو پھر حضرت عمر کے گستاخانہ انداز پر اظہار افسوس یا خاموشی کے علاوہ یہ صورت ممکن نہیں ہے کہ ان کی فضیلت بیان کی جائے۔ کیونکہ اس میں توہین رسول مضمر ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو پھر اس طرح سے بھی سوچا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ کی مصلحت کہ انہوں نے منافق کی نماز جنازہ پڑھائی اور آئندہ کے لئے آیت نازل ہو گئی کہ کہیں یہ ریت نہ پڑ جائے۔ رسول اللہ نے نماز پڑھائی تو وہ بھی حق تھا۔ کیونکہ دینی

معاملات میں تو کم از کم ہر مسلمان یہی سمجھتا ہے کہ رسول اللہ اپنی خواہش نفس سے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ جب تک اللہ کی طرف سے حکم نہ ہو جائے۔

اس گفتگو کے بعد صرف دو صورتیں نظر آتی ہیں کہ اگر رسول کا نمازِ جنازہ پڑھانا حق تھا تو حضرت عمر کا گستاخانہ انداز سے روکنا ناحق تھا۔ لہٰذا افسوس کیا جائے اور اگر رسول کا نمازِ جنازہ پڑھانا غلط تھا اور حضرت عمر نے صحیح ٹوکا تو ان کی فضیلت کی بات ہوئی۔ مگر اس صورت میں رسول اللہ کی کتنی توہین ہوتی ہے اندازہ لگائیے۔

اسیرانِ بدر کے بارے میں عمرؓ کی رائے:

اسیرانِ بدر کے معاملہ میں جب اختلاف ہوا تو حضرت عمر نے جو رائے دی وحی اس کے موافق آئی۔

(الفاروق محمد الدین اینڈ سنز لاہور ص ۵۳۳)

حضرت عمر کی محبت میں پریشان خیالی دیکھئے کہ پہلے تو مولانا شبلی نے "الفاروق" میں صحیح بخاری کی اس روایت کو سینے سے لگایا۔ اور پھر سیرت النبی لکھتے وقت یہ یاد نہ رہا کہ "الفاروق" میں کیا لکھ آئے ہیں اور خود ہی اس روایت کی اتنی وضاحت سے تردید کردی کہ مزید کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ ہم من عن یہ عبارت "سیرت النبی" سے نقل کرتے ہیں۔

"عام روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر صحابہ سے مشورہ کیا کہ اسیرانِ جنگ کے معاملے میں کیا کیا جائے حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ سب اپنے ہی عزیز واقارب ہیں۔ فدیہ

لیکر چھوڑ دیئے جائیں۔ لیکن حضرت عمرؓ کے نزدیک اسلام کے مسئلہ میں دوست دشمن، عزیز و بیگانہ، قریب و بعید کی تمیز نہ تھی اس لیے انہوں نے یہ رائے دی کہ سب قتل کر دیئے جائیں۔ اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو آپ قتل کرے۔ آنحضرت نے صدیق اکبر کی رائے کو پسند کیا اور فدیہ لیکر چھوڑ دیا۔ اس پر خدا کا عتاب آیا اور یہ آیت اتری۔

لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم

(انفال - ۹)

"اگر خدا کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا جو کچھ تم نے لیا ہے اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔" آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ یہ عتاب ربانی سن کر رو پڑے۔

یہ روایت تمام تاریخوں میں مذکور اور احادیث میں بھی موجود ہے لیکن سبب عتاب کے بیان میں اختلاف ہے۔ ترمذی میں جو روایت ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس وقت تک مال غنیمت سے متعلق احکام نہیں آئے تھے عرب کے عام دستور کے موافق صحابہ غنیمت میں مصروف ہو گئے۔ اس پر عتاب آیا لیکن چونکہ اس کے متعلق پہلے کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا اس لئے یہ جرم معاف کر دیا گیا اور حکم آیا کہ مالِ غنیمت جو ہاتھ آ چکا حلال ہے۔ قرآنِ مجید میں عتاب کے بعد یہ الفاظ ہیں۔

فکلوا مما غنمتم حلالا طیبا "تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلال طیب ہے۔"

اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ مال جو ہاتھ آیا تھا وہ حلال

کر دیا گیا اور وہ مال غنیمت تھا۔ غرض صحیح مسلم اور ترمذی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عتاب فدیہ لینے یا مال غنیمت لوٹنے پر تھا صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ جب عتاب کی آیت نازل ہوئی تو آپ رونے لگے اور جب حضرت عمرؓ نے سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔ تمہارے ساتھیوں نے جو فدیہ لیا۔ اس پر جو خدا کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس پر میں رو رہا ہوں۔ عموماً لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا کہ عتاب اس پر آیا کہ اسیرانِ جنگ کو قتل کیوں نہیں کر ڈالا۔ چنانچہ لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا۔

کسی نبی کو یہ مناسب نہیں کہ بغیر اچھی طرح خونریزی کرنے کے لوگوں کو قیدی بنائے۔ (انفال۔ ۹)

لیکن اس آیت کا صرف یہ ماحصل ہے کہ میدانِ جنگ میں جب تک کافی خونریزی نہ ہو چکے قیدی بنانا مناسب نہیں۔ اس سے یہ کیونکر ثابت ہو سکتا ہے کہ اگر خونریزی سے پہلے لوگ گرفتار کر لیے گئے تو لڑائی کے بعد بھی وہ قتل کیے جا سکتے ہیں۔

(سیرت النبی جلد ۱، ناشران قرآن لاہور، ص ۳۳۶-۳۳۷)

سیرت النبی کی روشنی میں یہ صورت حال سامنے آتی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی رائے تھی کہ قیدیوں کو فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ یہ سب اپنے ہی عزیز واقارب ہیں۔ حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ سب کو قتل کر دیا جائے اور ہر شخص خود اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ رسول اللہ نے پہلی رائے پسند فرمائی اور فدیہ لیکر قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ عتاب کی آیت نازل ہوئی اور یہ آیت اس بات پر نازل نہیں ہوئی کہ (عمر کی رائے کے مطابق)

قیدیوں کو قتل کیوں نہ کیا۔ بلکہ فدیہ قبول کرنے پر نازل ہوئی۔ چنانچہ یہ دعوے کہ بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں حضرت عمر کی رائے کے مطابق آیت نازل ہوئی۔ بالکل بے بنیاد ہو جاتا ہے۔ اگر آیت اس بات پر نازل ہوتی کہ قیدیوں کو قتل کیوں نہ کر دیا۔ تب یہ دعویٰ صحیح ہوتا۔ چنانچہ لوگوں نے اس دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے انفال۔ ۹ سے استدلال کیا۔ مگر مولانا موصوف نے (خدا انہیں جزائے خیر دے) اس کو بھی مسترد کر دیا۔

حضرت عمرؓ کے بارے میں روایتیں وضع کرنے والوں کو اتنی حدیثیں وضع کر کے اطمینانِ قلب حاصل نہ ہوا تو انہوں نے ایک اور حدیث وضع کر کے ساری کسر پوری کر دی اور علماء و واعظین نے بھی اپنا فرض پورا کیا کہ عوام الناس میں اس حدیث کو اچھی طرح پھیلا دیا۔

لو کان لبعدی نبی لکان عمر بن الخطاب۔

اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن خطاب ہوتے۔

(صحیح ترمذی باب مناقب عمر صد ۴۶۴)

یہ حدیث صحیحین کی اور کتابوں میں بھی درج کی گئی ہے۔ مگر یہ ایک ایسی حدیث ہے کہ جس کے سلسلہ رواۃ پر غور و فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کا موضوع ہونا بالکل واضح ہے۔ یہ اہل سنت کے اس عقیدہ سے ٹکراتی ہے کہ رسول اللہ کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر تھے۔ کتنی دلچسپ بات ہے کہ افضل تو ابوبکرؓ ہوں اور مفضول عمرؓ کو نبوت کے لائق سمجھا جائے۔

بہت سے ایسے موقع بھی آئے کہ یہ حدیث عمرؓ کو فائدہ پہنچا سکتی تھی۔ مگر انہوں نے کبھی یہ حدیث نہیں بیان کی۔ سقیفہ میں جب

کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر نکالتے تھے بعض اوقات آپ کی تنخواہ آجاتی تھی تو آپ اپنی تنخواہ میں سے ادا کرتے تھے۔ (تاریخ طبری حصہ سوم

جب حضرت عمرؓ نے انتقال فرمایا تو اس وقت آپ پر بیت المال کے چھیاسی ہزار درہم واجب الادا تھے۔ مولانا شبلی صحیح بخاری کی ایک روایت کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ پر چھیاسی ہزار کا قرضہ ضرور تھا۔ لیکن وہ اس طرح ادا کیا گیا کہ ان کا مسکونہ مکان بیچ ڈالا گیا۔ جس کو امیر معاویہ نے خریدا۔" (الفاروق)

دس سال چھ ماہ اور چند دن کی خلافت میں اتنی کثیر رقم کا مقروض ہو جانا وہ بھی حضرت عمر کا، کہ جن کے لئے مشہور ہے کہ آپ بڑی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔ اخراجات کے سلسلہ میں آپ کا انداز کیا تھا اور آپ ہمیشہ بیت المال کے کیوں مقروض رہتے تھے۔ اس کا علم ہمیں نہ ہو سکا۔ تاریخ کی کتابوں میں سے صرف آپ کی خوش خوراکی اور اچھی غذا کا پتہ چلتا ہے۔

ازالۃ الخفاء کے مطابق:

امام مالک بروایت اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ اور وہ انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے دیکھا کہ حضرت عمر فاروق کے لئے ایک صاع (ساڑھے تین سیر) کھجوریں لائی جاتیں اور آپ ان میں سے ردی اور جید سب تناول کرتے (ازالۃ الخفاء مقصد دوم: مآثر عمر فاروق)

کنزالعمال کے مطابق:

عن السائب بن یزید قال ربما تعشیت عند عمر بن الخطاب فیاکل الخبز واللحم ثم یمسح علی قدمیہ ثم یقول ہذا مندل عمر وآل عمر سائب بن یزید کہتے ہیں۔ میں نے اکثر رات کا کھانا عمر بن خطاب کے ساتھ

خلافت کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا تو انصار اپنی فضیلتیں پیش کر رہے تھے. مہاجر اپنے قریش ہونے پر فخر کر رہے تھے. ابوبکرؓ کی امامت نماز کا حوالہ دیا جا رہا تھا. مگر نبیؐ کی سطح کا انسان یہ نہیں کہتا کہ تم خلافت پر کیوں جھگڑ رہے ہو. رسول کا نائب تو اصولی طور پر میں ہوں.
کیا تم میں سے کسی کو اس حدیث کا علم نہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ لوکان بعدی نبی لکان عمر بن الخطاب ۔ اب اگر میں باب نبوت بند ہو جانے کے سبب نبی نہیں بن سکتا تو " نائب نبی " میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا. پس یا تو مجھے خلافت دو یا میں جس کو خلیفہ بنا دوں اسے مان لو۔

نبی کے لیے جس علم وحلم وصبر و شجاعت اور توازن مزاج کی ضرورت ہے وہ حضرت عمر میں نہ تھا۔ آپ کی پوری زندگی اس امر پر گواہ ہے۔ خاص طور سے طرز جہاں بانی اور خاص و عام سے آپ کا برتاؤ جس کی تفصیل آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

حضرت عمرؓ کی عادات و خصائل

قرض داری • بسیار خوری • آلِ خطاب کا رُومال • کپڑے کا ایک جوڑا

آپ اکثر بیت المال سے قرض لیا کرتے تھے۔ علامہ طبری کے مطابق :

سلام بن مسکین حمی روایت ہے کہ حضرت عمر کو جب مال کی ضرورت ہوتی تو بیت المال کے خزانچی کے پاس جا کر اس سے کچھ قرض مانگتے تھے۔ بعض اوقات آپ بہت زیادہ تنگدست ہو جاتے تھے۔ تو بیت المال کا افسر آپ کے پاس آکر سخت تقاضا کرتا تھا تو آپ اس

کھایا ہے۔ وہ روٹی اور گوشت کھاتے تھے پھر اپنے قدموں پر مل لیتے تھے پھر کہتے تھے کہ یہ عمر و آل عمر کا رومال ہے۔"

(کنز العمال جلد ۶ مطبوعہ حیدر آباد دکن ص ۳۴۶)

ڈاکٹر خورشید احمد فاروقی ابن سعد کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

سیدنا عمر فاروق کی غذا بھی جسم کے مطابق تھی۔ ہر دن کھانے کے علاوہ وہ ایک صاع (ساڑھے تین سیر) کھجور کھا لیتے تھے، گوشت اور گھی ان کے روزمرہ کے کھانے میں داخل تھا۔ لیکن دودھ اور رقیق چیزوں کے مقابلے میں وہ خشک غذائیں جیسے کھجور اور کشمکش زیادہ پسند کرتے تھے۔ رقیق چیزوں میں انہیں کشمکش یا کھجور کی بنیند مرغوب تھی۔ وہ کھانا کھا کر ہاتھ نہیں دھوتے تھے، بلکہ اپنے سینڈل سے پونچھ لیتے تھے اور کہتے کہ یہ عمر اور آل عمر کے رومال ہیں۔ ابن سعد ۳/ ۳۱۸ - ۳۱۹

(حضرت عمر کے سرکاری خطوط، ادارۂ اسلامیہ لاہور ص ۱۹، ۲۰)

"ابوبکر بروایت ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق کی خدمت میں کھانا لایا جاتا، نان کے ساتھ خواہ گوشت ہو یا دودھ۔ روغن زیت سرکہ اور خواہ ساگ وغیرہ آپ تناول فرماتے اور تناول کرکے انگلیاں چاٹتے اور پھر دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملتے اور فرماتے کہ آل عمر کا تولیہ یہی ہے (ازالۃ الخفا مآثر عمر فاروق)

جب ہم حضرت عمر کے ذرائع آمدنی کو دیکھتے ہیں تو اور حیرت ہوتی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ "خلافت کے چند برس بعد انہوں نے صحابہ کی خدمت میں مصارف ضروری کے لئے درخواست کی اس پر حضرت علی کی رائے کے موافق اس قدر تنخواہ مقرر ہو گئی جو معمولی خوراک اور لباس کے لئے کافی ہو۔ سنہ ۱۵ھ میں جب لوگوں کے روزینے

مقرر ہوئے تو اور اکابر صحابہ کے ساتھ ان کے بھی پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر ہوئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہایت بے تکلفی اور سادگی سے رہتے تھے۔ کپڑوں میں اکثر پیوند ہوتا تھا۔ ایک دفعہ دیر تک گھر میں رہے۔ باہر آئے تو لوگ انتظار کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ پہننے کو کپڑے نہ تھے اس لئے انہیں کپڑوں کو دھو کر سوکھنے کو ڈال دیا تھا۔ خشک ہو گئے تو وہی پہن کر باہر نکلے۔" (الفاروق)

بیت المال سے اتنی تنخواہ مقرر تھی کہ معمولی خوراک اور لباس کے لئے کافی ہو۔ اور پھر پانچ ہزار درہم سالانہ وظیفہ الگ۔ مگر جب انتقال فرمایا تو چھیاسی ہزار درہم کے قرضدار تھے۔ لہٰذا اوسطاً تقریباً سات ہزار درہم سالانہ کے مقروض اور حالت یہ کہ ایک جوڑا تن پر۔ جیسے دھو کر ڈالا تو سوکھنے کے انتظار میں برہنہ بیٹھے ہیں۔ جبکہ کتب تاریخ میں حضرت عمر کے اور دوسرے ذرائع آمدنی کا بھی ذکر ہے۔ ڈاکٹر فارق طبقات ابن سعد کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ :

خلیفہ ہو کر عمر فاروق اور ان کے بال بچوں نے خزانہ سے کھایا پیا اور اپنے روپے سے تجارت بھی کی، تجارت میں کھجور اور غلہ ہی داخل نہ تھا جس کی پیداوار عمر فاروق کے فارموں اور نخلستانوں (یہ نخلستان مال غنیمت کے حصہ کے طور پر رسول اللہ نے عطا کیے تھے) میں ہوتی تھی۔ بلکہ دوسرے اصناف کا سامان بھی داخل تھا۔ عربی روایت بتاتی ہے کہ :

وہ تجارتی قافلے شام اور دوسرے ملکوں کو بھیجا کرتے تھے جن میں ان کا سامان یا حصے ہوتے تھے۔ (ابن سعد ۳/۲۷۸) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مال غنیمت کے سہام جو ۲ھ سے انہیں خلافت صدیقی کے آخر تک

برابر ملتے رہے تھے اور جن کی تعداد اور مقدار ان کے ابتدائی سالوں میں شام، مصر، عراق اور فارس میں نئے نئے محاذ کھلنے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ غنیمت کے سہام کا سلسلہ فاروقی خلافت کے آخر تک جاری رہا۔

(عمر فاروق کے سرکاری خطوط، ادارہ اسلامیہ لاہور، ۲۲، ۲۳)

بدمزاجی

ڈاکٹر خورشید احمد فارق کے مطابق:

عمر فاروق کے والد خطاب بدکلام بدمزاج اور تشدد پسند آدمی تھے۔ یہ صفات حضرت عمر کی سیرت میں بھی منتقل ہو گئے تھے اور ان کی پبلک نیز پرائیوٹ زندگی میں بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان صفات کی وجہ سے خلافت سے پہلے ہر وقت ان کے ہاتھ میں تلوار رہا کرتی تھی اور خلافت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد وہ مشہور درہ جس کے خیال سے لوگ کانپتے تھے اور جس سے وہ صحابی اور غیر صحابی دونوں کی خبر لیتے تھے ان کی بیویاں انہی صفات کا طعنہ دیکر اپنا دل ہلکا کرتی تھیں اور انہی صفات سے خائف ہو کر ان کی شادی کے پیغام رد کر دیتی تھیں۔ .... ہنستے بہت کم تھے۔ ظرافت و بذلہ سنجی سے طبیعت کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ جب غصہ آتا مونچھوں کو امیٹھ کر منہ میں لے لیتے اور زور زور سے ان میں سانس کی ہوا پھونکتے اور طیش زیادہ بڑھتا تو دانتوں سے اپنا ہاتھ کاٹنے لگتے حتیٰ کہ خون نکل آتا۔

(حضرت عمر فاروق کے سرکاری خطوط، ادارہ اسلامیہ لاہور ص ۱۸، ۱۹)

مدائنی کی روایت ہے کہ:

ام کلثوم (بنت ابی بکر) نے کہا میں ان کے ساتھ نکاح نہیں کروں گی۔

اس پر حضرت عائشہ نے فرمایا کیا تم امیر المومنین کے ساتھ نکاح کرنے سے انکار کرتی ہو؟ وہ بولیں ہاں! وہ بہت کھردری زندگی بسر کرتے ہیں اور خواتین کے ساتھ سخت مزاج ہیں۔

مدائنی کی ایک اور روایت کے مطابق آپ نے ام ابان بنت عتبہ بن ربیعہ کی طرف بھی نکاح پیغام بھیجا۔ مگر انہوں نے آپ کو پسند نہیں کیا وہ کہنے لگیں۔

وہ اپنے دروازے کو بند رکھتے ہیں (یعنی کہیں آنے جانے نہیں دیتے) مال خرچ نہیں کرتے۔ نیز آتے جاتے ہر وقت ان کا منہ بنا رہتا ہے۔

(تاریخ طبری حصہ سوم، نفیس اکیڈمی ص ۲۴۹ - ۲۵۰)

بعض اوقات یہ بدمزاجی وحشت و بربریت کا رنگ اختیار کر لیتی، اس کی کئی مثالیں حسب موقع پیش کی جا چکی ہیں۔ اب ایک اور واقعہ پیش خدمت ہے .... اس امید کے ساتھ کہ شاید عمرؓ کے ماننے والے انہیں مہذب دنیا کے سامنے ایک قابل تقلید انسان کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے کچھ ہچکچائیں۔

وحشت و بربریت

حضرت عمر نے ایک گھر سے رونے کی آواز سنی آپ کوڑا لئے ہوئے گھس گئے اور جو لوگ وہاں تھے ان کو مارتے ہوئے اس رونے والی تک پہنچے اور اس کو اتنا مارا کہ اس کا دوپٹہ گر گیا، پھر اپنے غلام سے کہا "اس رونے والی کو مار۔ تیرا برا ہو خوب مار۔ کیونکہ یہ چیخ کر روتی ہے۔ اور چیخ کر رونے والی کا کچھ پاس لحاظ نہیں (پھر آپ نے گھر والوں سے مخاطب ہو کر فرمایا) یہ تمہارے غم کی وجہ سے نہیں روتی بلکہ اس واسطے آنسو بہاتی ہے کہ تم سے کچھ وصول کرے۔ یہ مُردوں کو قبروں میں اور زندوں کو گھروں میں تکلیف دیتی ہے اور صبر سے روکتی ہے حالانکہ خدا نے صبر کا حکم دیا ہے اور یہ بے صبری کا حکم دیتی ہے۔ حالانکہ خدا نے اس سے منع کیا ہے۔ (ازالۃ الخفاء مآثر عمر فاروقؓ)

آپ جناب عمر کی بدمزاجی، سنگ دلی اور وحشت و بربریت کے واقعات پڑھ چکے ہیں .... طبیعت کی درشتگی ان کی شخصیت کا جزو اعظم تھی۔ ایسی ہستی کے بارے میں ذیل میں دی گئی روایتیں ملاحظہ فرمایئے کہ یہ کس قدر دلچسپ ہیں۔

گریہ وزاری! "محب الطبری بروایت عبداللہ بن عیسیٰ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق کے چہرے پر بوجہ کثرت گریہ آنسوؤں سے دو خط پڑ گئے پڑ گئے تھے۔"

"محب الطبری بروایت ابی جعفر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں حضرت علیؓ ملے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ بھی آپکے ہمراہ تھے، سلام کے بعد دونوں کھڑے ہو گئے اور سبطین دونوں کے دائیں بائیں حضرت عمر فاروق رونے لگے کیونکہ آپکی عادت تھی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: امیر المومنین آپ کیوں روتے ہیں۔ فرمایا " میں کیوں نہ روؤں میرے رونے کا اور کون احق ہے۔ اے علی میں اس امت کا خلیفہ کیا گیا ہوں! اس کے درمیان حکم کرتا ہوں۔ نہیں معلوم اس کے خیر کے ساتھ کرتا ہوں یا شر کے ساتھ۔ حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا واللہ! آپ تو فلاں فلاں امور میں عدل ہی کرتے ہیں" تاہم ابھی آپ گریہ بکا سے خاموش نہیں ہوئے بعد ازاں حضرت امام حسنؓ نے آپ کے عدل و انصاف کا ذکر کیا اور پھر حضرت امام حسینؓ نے" اب آپ خاموش ہوئے اور سبطین سے فرمایا آپ میرے عدل و انصاف کی شہادت دیتے ہیں۔ سبطین حضرات علی مرتضیٰ کی طرف دیکھنے لگے، آپنے فرمایا " بیشک شہادت دو۔ اور تمہارے ساتھ میں بھی شہادت دیتا ہوں۔ (ازالۃ الخفاء)

مندرجہ بالا روایتیں موضوعہ ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔۔۔ کیا یہ بات ممکنات میں سے ہے کہ حضرت عمر جیسا آدمی اس طرح آنسو بہلائے! ہم حیران ہیں کہ ہر وقت کوڑا ہاتھ میں رکھنے والا یہ شخص رونے کے لئے کیسے وقت نکالتا ہو گا۔۔۔۔ اور رونا بھی اتنا زیادہ کہ آنسوؤں نے رخساروں پر خط ڈال دیئے تھے۔ کیا آپ لوگوں کو مارتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔!!۔۔۔۔ ایسی رقت قلب اور ایسی سنگ دلی! یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی پتھر کے لئے کہا جائے کہ وہ ایک ہی وقت میں پتھر بھی ہے اور پانی بھی۔

رونے کے بارے میں دوسری روایت اپنی ضرورت خود بتا رہی ہے۔ فاروق اعظم رو رو کر اپنے عدل و انصاف پر شہادت کی التجا کر رہے ہیں۔۔۔۔ وہ بھی کس سے؟ فاطمہ زہراؑ کے جگر گوشوں سے، علی مرتضیٰؑ کے بیٹوں سے۔۔۔۔ یہ وہی فاطمہ ہیں کہ جو فاروق اعظم کے ظلم اور ناانصافی کا ایسا شکار ہوئیں کہ جب تک زندہ

رہیں اُن سے کلام نہیں کیا۔ اور مرنے سے پہلے وصیت کر گئیں کہ یہ شخص اُن کے جنازہ میں شریک نہ ہو۔ اور یہ وہی علی ہیں کہ فاروق اعظم کے ظلم وستم اور زنا الفعانی کا شکار ہو کر پچیس برس سے اوپر خلافت ظاہری سے محروم رہے۔

یہ راوی کی ضرورت تھی کہ اس نے متعدد تریہ کے اظہار کے لئے جناب عمر کے رخساروں پر نشان ڈال دیئے تاکہ ان کی قسی القلبی کی کراہت کو رقیق القلبی کی روایت سے دور کیا جائے۔ اور پھر راوی کی ضرورت نے ایک اور کمال کر دکھایا کہ اسلام کی ان بزرگ ترین ہستیوں کی مہر شہادت علی فاروق پر لگوائی کہ جو خود اُن کے ظلم زنا الفعانی کا شکار ہونے تھے ... تاریخ اسلام راویوں کے ایسے کمالات سے بھری ہوئی ہے کہ جنا نہیں اپنی ضرورتوں کے تحت دکھانا پڑے۔

دخل در معقولات

جنگ ہوتی یا صلح، اقتصادی مسئلہ ہوتا یا سیاسی، اجتماعی یا شخصی وہ اس میں مداخلت ضرور کرتے اور اپنی سمجھ کے مطابق رائے ضرور دیتے۔ (عمر فاروق کے سرکاری خطوط صد ۴۴)

ام سلمہ نے کہا: "خدا کے لئے بس کرو ابن خطاب تم تقریباً ہر معاملہ میں دخیل ہو چکے ہو اب آنحضرت کے گھریلو معاملات تک میں دخل دینا چاہتے ہو۔" (اردو ترجمہ الیشنحان صد ۱۲۹)

دخل در معقولات کا ایک انداز بڑا دلچسپ اور قابل غور ہے۔ اکثر مواقع پر حضرت عمر کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ "یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجیئے کہ اس کی گردن مار دوں۔" اور یہ فقرا حمایت رسول میں کہا جاتا تھا۔ حالانکہ حمایت رسول میں تلوار کھینچنے والے ایسے لوگ بھی موجود ہوتے تھے کہ جنہوں نے ایسے موقعوں پر تلوار کھینچی تھی کہ جب کسی کی گردن مارنے کے لئے خود اپنی گردن کو خطرہ میں ڈالنا پڑتا تھا۔ مگر یہ لوگ خاموش رہتے۔ بولتے تو صرف

حضرت عمر بولتے کہ اس وقت گردن مارنے والے کا کچھ نہیں بگڑ سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں چند واقعات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ رسول اللہ کے چچا جناب عباس فتح مکہ کے موقعہ پر ابوسفیان کو لیکر آنحضرت کے پاس آئے تو: "عمر رسول اللہ کے پاس گئے اور کہا یا رسول اللہ خدا نے دشمن خدا ابوسفیان کو بغیر کسی وعدہ اور معاہدہ کے ہمارے قابو میں کر دیا ہے آپ مجھے اجازت دیں کہ اسے قتل کردوں۔"

(طبری جلد ۱ صہ ۳۹۳)

۲۔ بنو تمیم کا ایک شخص ذوی الخویصرہ رسول اللہ کے پاس آیا اور کھڑا رہا۔ آپ اس وقت لوگوں کو عطا دے رہے تھے اس نے کہا کہ اے محمد آج جو کچھ آپ نے کیا ہے میں نے اسے دیکھا۔ رسول اللہ صلعم نے پوچھا پھر کیا دیکھا۔ اس نے کہا آپ نے عدل نہیں کیا۔ رسول اللہ صلعم کو غصہ آگیا۔ آپ نے فرمایا۔ مرد خدا اگر میرے یہاں عدل نہیں تو پھر کہاں ہوگا۔ عمر بن الخطاب نے کہا یا رسول اللہ صلعم اجازت ہو تو اسے قتل کردوں۔" (طبری جلد ۱ صہ ۳۹۳)

۳۔ ایک مہاجر کے قصہ میں (جب کہ مہاجر نے انصار میں سے ایک شخص کی پشت پر گھونسہ مارا اور عبداللہ ابن ابی منافق نے اس کے متعلق کچھ ہذیان بکا۔) حضرت عمر کا فرمانا یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔" (ازالۃ الخفا مقصد دوم صہ ۳۰۸)

۴۔ اسی طرح ابن صیاد کے معاملہ میں آپ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اسے قتل

کردوں۔ (ازالۃ الخفاء مقصد دوم صہ ۳۰۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر میں فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ بہت سے بنی ہاشم اور غیر بنی ہاشم سے اس دفعہ طوعاً و کرہاً آئے ہیں ورنہ انہیں ہم سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پس جس شخص کا بنی ہاشم میں سے کسی سے سامنا پڑے تو چاہیئے کہ اسے قتل نہ کرے اور جس کا عباس سے سامنا ہو تو چاہیئے کہ انہیں قتل نہ کرے۔ ابوحذیفہ نے کہا کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد اور اپنے بھائی بندوں کو تو قتل کریں اور عباس کو چھوڑ دیں۔ واللہ اگر ان سے میرا مقابلہ ہو گیا تو میں اپنی تلوار کو ان کا خون پلائے بغیر نہیں رہ سکتا آنحضرت کو جب اس امر کی اطلاع ہوئی تو آپ نے حضرت عمر فاروق سے فرمایا اے ابوحفص کیا عم رسول کے منہ پر تلوار ماری جائے گی۔ عرض کیا یا رسول اللہ مجھے فرمائیں کہ میں ابوحذیفہ کی گردن ماردوں۔

(ازالۃ الخفاء مقصد دوم) ص ۳۰۸ تا ۳۰۹)

"جب رسول اللہ صلعم پوری طرح مکہ جانے کے لئے تیار ہو گئے حاطب بن ابی بلتعہ نے ایک خط قریش کو لکھا اور اس میں اطلاع دی کہ رسول اللہ صلعم تمہارے مقابلے پر آرہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔

رسول اللہ صلعم کو بذریعہ وحی حاطب کی اس حرکت کی خبر ہوئی آپ نے علی بن ابی طالب اور زبیر بن العوام کو بلایا اور کہا کہ حاطب نے ہماری تیاری کی اطلاع ایک خط کے ذریعہ قریش کو دی ہے اور اس خط کو ایک عورت کے ہاتھ مکہ بھیجا ہے تم اسے جا کر پکڑ لو یہ دونوں مدینہ سے چلے اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسے جا پکڑا ۔۔۔۔۔۔۔۔ جب اس عورت نے دیکھا کہ یہ بغیر خط لئے پیچھا

نہیں چھوڑیں گے۔......... آپنے سر کی لٹیں کھولیں اور خط نکال کر علی کو دے دیا۔ وہ لے رسول اللہ صلعم کے پاس لائے۔ آپ نے حاطب کو بلا کر پوچھا تم نے یہ کیوں کیا۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں اللہ اور اس کے رسول پر سچا ایمان رکھتا ہوں۔ میرے ایمان میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔ ویسا ہی پکا مسلمان ہوں جیسا کہ تھا۔ مگر یہاں میرا کوئی نہیں ہے اور قریش میں میرے اہل وعیال ہیں۔ ان کی خاطر میں نے ایسا کیا۔ عمر نے کہا' اس نے ضرور نفاق برتا۔ یا رسول اللہ آپ مجھے اجازت دیں میں اس کی گردن ماردوں' رسول اللہ نے فرمایا عمر کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کو جنگ بدر میں تمام شرکائے بدر کی حالت بخوبی معلوم تھی، جس کی وجہ سے اس نے یہ ارشاد فرمایا کہ جو چاہو کرو۔ میں نے تمہاری مغفرت کردی۔" (تاریخ طبری حصہ اول صہ ۳۹۰ تا ۳۹۱)

حضرت عمر کو گردن مارنے کا شوق معلوم نہیں کیوں تھا۔

سیرت النبی (شبلی نعمانی) میں جلاد کے فرائض ادا کرنے والوں میں کئی حضرات کا نام لکھا ہے مگر ان میں بھی حضرت عمر کا نام نہیں ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب خود رسول اللہ کہتے کہ فلاں شخص کو قتل کر دیا جائے تو اس وقت حضرت عمرؓ تیار نہیں ہوتے۔ قبیلہ طے کا کعب بن الاشراف بدر کے مقتولین پر بڑا مشتعل تھا۔ طبری کے مطابق "اس نے رسول اللہ صلعم کے خلاف لوگوں کو جوش دلانا شروع کیا۔ وہ اشعار سناتا تھا اور مقتولین بدر پر نوحہ کرتا تھا۔ پھر یہ مدینہ آ گیا۔ اس کے بعد اس نے کسی عورت کی تعریف میں عاشقانہ شعر کہے۔ جس سے مسلمانوں کو سخت تکلیف ہوئی۔ اس پر رسول اللہ صلعم نے صحابہ سے کہا کون ہے جو اس کا خاتمہ کردے۔ بنی عبدالاشہل کے محمد بن مسلمہ نے کہا، اے رسول اللہ صلعم میں اس کا کفیل ہوتا ہوں

میں اسے قتل کر دوں گا (تاریخ طبری حصہ اول، نفیس اکیڈمی، ص۲۱۳)

معلوم نہیں حضرت عمر اس زمانے میں کہاں مصروف تھے کہ انہیں ایسی غیرت دلانے والی باتوں کی اطلاع نہیں ملی، ورنہ وہ یہ کہتے کہ یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن مار دوں مگر تاریخ میں ایک اور واقعہ موجود ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے حضرت عمر سے براہ راست ایک شخص کو قتل کرنے کا حکم دیا مگر آپ ایسا نہ کر سکے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ

"ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ ابو بکرؓ رسول کی خدمت میں آئے اور عرض کی یا رسول اللہؐ میرا گذر فلاں وادی سے ہوا۔ میں نے وہاں خوشنما شکل و شمائل اور بہت ہی خضوع و خشوع والے انسان کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا جاؤ اسے قتل کر ڈالو۔ ابو بکر گئے مگر جب اس شخص کو اسی حال میں پایا یعنی نماز پڑھتے ہوئے تو انہیں اچھا نہ معلوم ہوا کہ اسے قتل کریں سو رسولؐ کی خدمت میں پلٹ آئے آنحضرتؐ نے عمر سے کہا کہ تم جاؤ اسے قتل کر آؤ۔ حضرت عمر گئے اور انہوں نے بھی اسکو اسی حال میں پایا جس میں حضرت ابوبکر دیکھ کر پلٹ گئے تھے۔ انھیں بھی اس کا قتل گوارا نہ ہوا۔ رسولؐ کے پاس پلٹ آئے اور آکر عرض کیا یا رسول اللہ میں نے اسے بہت خشوع و خضوع سے نماز پڑھتے دیکھا اس لئے مجھے اچھا نہ معلوم ہوا کہ میں اسے قتل کر دوں اب رسالت مآبؐ نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ تم جاؤ اور جاکر اسے قتل کر ڈالو حضرت علی رسول اللہ کی خدمت میں پلٹے اور عرض کی "یا رسول اللہؐ میں گیا تو وہ جا چکا تھا میں نے اسے نہیں دیکھا۔ رسالت مآبؐ نے فرمایا اس شخص اور اس کے اصحاب کی حالت یہ ہوگی کہ وہ قرآن پاک پڑھیں گے مگر وہ انکے گلے سے نیچے نہیں اترے گا۔ دین سے یوں نکل جائیں گے جس طرح تیر ہدف کے پار ہو جاتا ہے۔ (مسند احمد بن حنبل، جلد ۳، ۱۳۱۳ھ مطبوعہ مصر)

کھڑے کھڑے پیشاب کرنے کی عادت

"امام لغوی نے حدیث عمر کی تخریج کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق کو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا تو آپ نے فرمایا!

"کھڑے ہو کر پیشاب نہ کیا کرو (بلکہ بیٹھ کر) ابو بکر لیسار بن نمیر سے روایت ہے کہ جب حضرت عمر فاروق پیشاب کرتے تو ڈھیلا لیتے پر اکتفا

کرتے اور پانی نہ لیتے۔" (ازالۃ الخفا مآثر عمر فاروق بحساب الجلال)

اعترافات اور پچھتاوے

حضرت عمر کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اکثر اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا کھلے دل سے اعتراف کر لیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی بڑی سادگی سے سچ بول جایا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ سچ آپ کے مرتبہ کو کم کرنے والا ہوتا۔۔۔۔ آپ اکثر اپنی زیادتیوں پر پچھتاتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ اپنی پیدائش پر بھی! چند روایتیں ملاحظہ ہوں۔

"ابو عمر بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عمر نے مجنونہ اور اس عورت کو جس نے چھ مہینے میں وضع حمل کیا ہو رجم کا حکم دیا۔ حضرت علیؑ نے حضرت عمر سے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا - الآیۃ - اور خدا نے مجنون سے قلم اٹھایا ہے۔ آخر حدیث تک پھر حضرت عمر کہا کرتے تھے لولا علی لہلک عمر یعنی اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ (ازالۃ الخفاء مآثر علی ابن ابیطالبؑ)

محب بیان کرتے ہیں کہ روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عمر فاروق ایک شب کو گشت کرنے نکلے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ آپ کے ساتھ تھے۔ آپ گشت کر رہے تھے کہ آپ کو ایک روشنی نظر آئی۔ آپ روشنی کے پاس گئے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شخص شراب پیتے ہوئے بیٹھا ہوا ہے اور ایک مغنیہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی ہے وہ بے خبر ہی تھا کہ آپ سامنے موجود ہوئے اور کہنے لگے آج کی شب سے پہلے اس بوڑھے قبر میں پیر لٹکانے والے سے قبیح تر واقعہ نہیں دیکھا۔ شیخ نے کہا:

"امیر المومنین بلکہ فعل قبیح تر یہ ہے کہ جو آپ نے کیا۔ کیونکہ آپ نے تجسس کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ تجسس سے منع فرماتا ہے۔ دوم یہ کہ آپ ہماری بغیر اجازت گھر میں داخل ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی مخالفت کی ہے۔ آپ نے کہا "بیشک! تم نے سچ کہا۔ اس کے بعد آپ اپنا کپڑا چباتے ہوئے باہر نکلے اور کہنے لگے "عمر تجھ کو تیری ماں گم کرے۔

(ازالۃ الخفاء مآثر عمر فاروق)

محب طبری نے عبداللہ بن ہشام سے روایت کی ہے کہ ہم نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے اور آپ عمر بن خطاب کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ عمر نے عرض کیا یا رسول اللہ جان کے سوا آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔ نبی کریمؐ نے فرمایا خدا کی

نستم جب تک تم کو جان سے زیادہ محبوب نہ ہوں گا۔ تم مومن نہ ہو گے۔ عمر نے کہا: خدا کی
ہی قسم آپ مجھ کو جان سے زیادہ محبوب ہیں ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا " اب تم مومن کامل ہوئے۔
(ازالۃ الخفا " ")

حضرت عبد ابن حمید، حصین، یعقوب، جعفر، سعید، حضرت ابن عباسؓ۔ آپ نے
فرمایا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا
یا حضرت میں ہلاک ہو گیا۔ آپؐ نے دریافت کیا۔ کیوں کس چیز نے ہلاک کیا۔ عمر نے
فرمایا " میں نے رات کو اپنی سواری پلٹ دی۔ حضورؐ یہ سُن کر خاموش ہو گئے اور
کوئی جواب نہ دیا۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی: نساءکم.... الخ یعنی تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں
تم جس طرح چاہو اُن کو استعمال کرو یعنی چاہے الٹا لٹا کر یا سیدھا لٹا کر، مگر دُبر
(پیچھے کی جگہ) اور حالتِ حیض میں پرہیز کرو۔ (ترمذی شریف تفسیر سورۃ بقر)

محب الطبری بروایت عبد اللہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت
عمر فاروق کو دیکھا کہ آپ نے گھاس کا تنکا زمین سے اٹھایا اور فرمانے لگے: کاش!
میں یہ گھاس کا تنکا ہوتا۔ کاش میری ماں مجھے نہ جنتی۔ کاش میں نسیاً منسیاً ہوتا۔
ازالۃ الخفاء مآثر عمر فاروق)

جنابِ عمر نے فرمایا: کاش میں دُنبہ ہوتا، میرا مالک مجھے (کھلا پلا کر) موٹا کرتا۔
پھر مجھے ذبح کرتا۔ پھر مجھے کھا جاتا اور خارج کر دیتا۔ اور میں انسان نہ ہوتا۔

باغیانہ روش نور الابصار ص۶۲ باب مناقب عمر از علامہ شبلنجی، طبع مصر ۱۳۶۷ھ)

حضرت عمر کا مزاج بنیادی طور سے اسلام کے مطابق نہ تھا کہ یہ مکمل اطاعت
سُپردگی کا تقاضہ کرتا ہے آپ دائرہ اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن پیغمبر اسلام
کے حضور میں جسارت بھی فرماتے تھے اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ کھُلی بغاوت پر اُتر آئے تھے۔

آپ خلیفہ بنے تو پورے طور سے خود مختار تھے۔ آپ نے اپنے اختیار سے حلال
کو حرام کیا۔ اور اسلام میں نئی نئی ایجادیں کیں، اگر آپ کو مسلمانوں کا خوف نہ ہوتا تو اسلام
کا چہرہ ہی بدل دیتے۔ ذیل کی دو باتوں سے اس روش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۱)

" ہم سے سعید بن ابی مریم نے بیان کیا مجھ کو محمد بن جعفر نے خبر دی مجھ کو زید بن

اسلم نے اپنے باپ سے، انہوں نے کہا حضرت عمر نے حجرِ اسود کو کہا "قسم خدا کی میں جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے نہ تجھ سے فائدہ ہو سکتا ہے نہ نقصان ۔ اور اگر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا ہوتا تجھ کو چومتے ہوئے، تو میں تجھ کو کبھی نہ چومتا۔"

(بخاری ۔ کتاب الحج)

کسی چیز کو چومنا اس کے احترام کی علامت ہے...... اور جناب عمر کے احترام کو ملاحظہ فرمائیے کہ حجرِ اسود کو چومتے بھی ہیں، اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی اچھی طرح توہین بھی کرتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پہ طنز فرما رہے ہیں ۔

(۲)

شیخین بروایت ابی وائل شقیق بن سلمہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں ایک دفعہ شیبہ کے ساتھ خانہ کعبہ کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا، جہاں مجلس میں حضرت عمر فاروق بھی تھے ۔ آپ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ کعبہ میں سرخ و سفید کچھ نہ چھوڑوں ۔ اور سب مسلمانوں کے درمیان تقسیم کردوں ۔ ابو وائل شقیق بن سلمہ کہتے ہیں، میں نے کہا آپ ایسا نہیں کر سکتے ۔ فرمایا کیوں ؟" میں نے عرض کیا آپ کے دونوں صاحبوں (یعنی آنحضورؐ اور حضرت صدیق) نے ایسا نہیں کیا ۔ فرمایا بیشک انہی دونوں شخصیتوں کی پیروی کی جائے گی ۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت عمر فاروق نے کہا کہ میں آج خانہ کعبہ سے نہیں نکلوں گا ۔ جب تک کہ میں یہ سب مال مسلمانوں میں تقسیم نہ کردوں ۔ میں نے کہا آپ ایسا نہیں کریں گے ۔ فرمایا کیوں ؟ میں نے کہا اس لئے کہ آنحضرتؐ اور حضرت صدیق نے باوجود اپنی منزلت اور احتیاج کے کبھی خانہ کعبہ کا سارا سامان نہیں نکالا ۔ یہ سن کر حضرت عمر اٹھ کھڑے ہوئے اور خانہ کعبہ سے نکل آئے ۔" (ازالۃ الخفاء ماثر عمر فاروق)

التماس سورہ فاتحہ برائے تمام مرحومین

۱) شیخ صدوق
۲) علامہ مجلسی
۳) علامہ ساظہر حسین
۴) علامہ سید علی نقی
۵) بیگم و سید عابد علی رضوی
۶) بیگم و سید احمد علی رضوی
۷) بیگم و سید رضا امجد
۸) بیگم و سید علی حیدر رضوی
۹) بیگم و سید سجاد حسن
۱۰) بیگم و سید مردان حسین جعفری
۱۱) بیگم و سید جبار حسین
۱۲) بیگم و مرزا توحید علی
۱۳) سید حسین عباس فرحت
۱۴) بیگم و سید جعفر علی رضوی
۱۵) سید انعام حسین زیدی
۱۶) سیدہ دعا زہرہ
۱۷) سیدہ رضویہ خاتون
۱۸) سید نجم الحسن
۱۹) سید مبارک رضا
۲۰) سید تہنیت حیدر نقوی
۲۱) بیگم و مرزا محمد ہاشم
۲۲) سید باقر علی رضوی
۲۳) بیگم و سید باسط حسین
۲۴) سید عرفان حیدر رضوی
۲۵) بیگم و اخلاق حسین
۲۶) سید ممتاز حسین
۲۷) بیگم و سید اختر عباس
۲۸) سید محمد علی
۲۹) سیدہ رضیہ سلطان
۳۰) سید مظفر حسنین
۳۱) سید باسط حسین نقوی
۳۲) اکرام محی الدین
۳۳) سید ناصر علی زیدی
۳۴) سید وزیر حیدر زیدی
۳۵) ریاض الحق
۳۶) خورشید بیگم